ماہتاک

سنگت

کوئٹہ

AUGUST 2024

میر ساگر

تخمِ آوارگی ! اے دلِ مبتلا ! جا تجھے عشق ہو
آہ کے بادشہ ! درد کے کبریا ! جا تجھے عشق ہو

اے غزالِ سُخن ! آیتِ نسترن ! زرد ہو یہ بدن
رب تجھے درد دے ' درد بھی لا دوا ' جا تجھے عشق ہو

عشق ہو ' جا تجھے اے بتِ نینوا ! کج اَدا ' بے وفا
ہم فقیروں نے جو کہہ دیا ' کہدیا.....جا تجھے عشق ہو

ہے سرودِ اَلَم سوزِ پُر انتہا چھیڑ کوئی صدا
صاحب خوش گلو! مطربِ خوشنوا ! جا تجھے عشق ہو

راہ چلتے ہوئے ایک درویش سے گفتگو ہو گئی
مُسکرا کر مجھے میر اُس نے کہا جا تجھے عشق ہو !

Reg No. DCS-6 مسلسل ماہانہ اشاعت کا 27 واں سال

ماہتاک

سنگت

کوئٹہ

Vol.27
JULY 2024
NO.08

ایڈیٹر

شاہ محمد مری

پرنٹر

صادق پرنٹنگ پریس کوئٹہ

ایڈیٹوریل بورڈ

جاوید اختر، جمیل بزدار، عابدہ رحمٰن، جہاں دوست، شاہ ملوک

قیمت 200 روپے | شش ماہی 1200 روپے | سالانہ 2400 روپے

ISSN-2520-4070

ملتان : رانا شہباز 03009632552 ،اور نواز پاندا 03008634392

کراچی : عیسیٰ بلوچ 03222609415 ،اور شاہ زمان 03002103503

ساہیوال : زکریا خان 03006931011

0812827968 , 03003829300 editor@sangatacademy.net

MARRI LAB DR SHER MUHAMMAD ROAD QUETTA www.sangatacademy.net

HUMBOAIN SALAAM 5

علی نواز قاضی نظامانی

SHONGAAL

بلوچ راجی مُچی 3

POHOZAANT

فلسطین، عالمی ریاستی تشدد اور طلباء تحریک	سارہ علی	6
کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر	شاہ محمد مری	9
سنگت اکیڈمی: جہدِ مسلسل کا استعارہ	جاوید اختر	11
سنگت اکیڈمی کی سرگرمیاں	منیر رئیسانی	14
ریاست او انقلاب	شاہ محمد مری	16
خطرات کی زد پر آیا پاکستان	ضامن چنگیزی	18
ابن عربی	زرینہ بلوچ	48

KITAB PACHAAR

کتاب کا قیدی۔۔(صفیہ حیات)	ساجد علی ساجد	19

KISSA

مزدور کی بیٹی	شبینہ رفعت	26
قاتل کا سراغ	مبشر الیاس	29
ماث	میکسم گورکی/شاہ محمد مری	32
پونم	آغا گل	35
وھاو	مہتاب جکھرانی	38
زمیں جنبد	سلمٰی جیلانی	39
اندھیر نگری!	عابدہ رحمٰن	41
چاپ	مصباح نوید	44

SHERAANI RALI

میر ساگر، نسیم سید	--
کاوش عباسی، منیر رئیسانی	5
لالہ رخ	8
رخشندہ نوید، رضوان علی، غنی پہوال	10
آمنہ ابڑو	13
شان گل	15
شامیر، فضل احمد خسرو	17
ندیم ملک	20
مایا کوفسکی	22
نیلم احمد بشیر، قندیل بدر	24
سندھو پیرزادہ، عیسیٰ بلوچ، طاہرہ احساس جتک	25
بدر سیماب	26
ڈاکٹر خالد سہیل	31
شان گل، زاہد راھی	33
عاقب توقیر، ضیاء بلوچ	34
عابد رضا	40
زوراخ بزدار	46

بلوچ راجی مُچی

ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ اور اُس کی بلوچ یک جہتی کمیٹی نے بہت تدبر سے دو کمال کام کیے:

1۔قومی سطح پر آل بلوچ اجتماع کا تصور

2۔اس اجتماع کے لیے گوادر کا انتخاب

بلوچ راجی مچی یا بلوچ قومی اجتماع دراصل یوسف عزیز مگسی اور عبدالعزیز کرد کی طرف سے منعقد کردہ اُس اجتماعات کی پیروی ہے جو انہوں نے 1932 میں جیکب آباد میں اور 1933 میں حیدرآباد منعقد کیے تھے۔ یہ قومی اجتماعات تاریخ میں ''آل انڈیا بلوچ کانفرنس'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سو سال گزرنے کے بعد اس آئیڈیا کو دوبارہ زندہ کرنا بہت خوش آئند بات ہے۔ عوام جس قدر زیادہ تعداد میں جمع ہوں اتنا فائدہ ہوتا ہے؛ سماج کو بھی، بلوچ قوم کو بھی اور مجموعی طور پر سیاست کو بھی۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ بہت بڑے بلوچستان میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے بلوچوں کو ایک پلیٹ فارم پہ اکٹھا کیا گیا۔ آج تک بلوچ مقامی طور پر اپنے اپنے قبائلی علاقوں میں سرگرمیاں کرتے رہے۔ وہ ایک دوسرے سے صرف جغرافیائی طور پر ہی کٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ سیاسی اور معاشی طور پر بھی ان میں روابط کم تھے۔ بلوچ یک جہتی کمیٹی نے پورے بلوچ کو بہ حیثیت قوم اکٹھا کر دیا۔ ساری قبیلوی سرحدیں توڑ دیں، ساری علاقائی دوریاں ختم کر دیں، اور کامیابی کے ساتھ پوری قوم کو ایک کر دیا۔ اور یہ کام لوگوں کی اپنی بھرپور شمولیت کے ساتھ ہوا۔ مشرق میں کوہِ سلیمان کے بلوچوں نے طویل سفر کر کے اور سرکاری رکاوٹوں کے باوجود ہزاروں میل دور مغرب میں کوہِ باتیل تک پہنچنے کی تکالیف رضا کارانہ انداز میں جھیلیں۔ دور ڈیرہ غازیخاں کے بزدار بلوچ نے کھیتران اور مری بلوچ کے علاقوں میں سے گزر کر سبی و ڈھاڈر سے ہوتے ہوئے بولان و دشت عبور کرتے ہوئے کوئٹہ پہنچنا تھا۔ اور وہاں سے مستنگ و منگوچر اور خضدار و بیچ سے گزر کر گوادر جانا تھا؛ ایک نعرے کے تحت، ایک جذبے تلے اور ایک شناخت کے بیج بوتے ہوئے۔ مبالغہ نہ ہو تو یہ اس صدی کا بڑا آئیڈیا تھا۔ اس بڑے قومی عوامی کام میں نہ سردار رکاوٹ ڈال سکا، نہ قبائلی تفاخر اس میں حائل ہو سکا اور نہ ہی زمینی دوری اور فاصلوں نے اس جذبے میں کمی پیدا کی۔ سارا وطن ایک ہو گیا، سارے بلوچ واحد بلوچی شناخت کے ساتھ ایک ہو گئے۔

شاید سو سال بعد کی ترقی یافتہ دنیا میں اس بات کی اہمیت نہ رہے مگر آج اس فیوڈل معاشرے کے پس منظر میں یہ بات بہت اہم ہے کہ قبائلی بلوچ خواتین کی قیادت میں چلنے کے لیے تیار ہوا۔ اُس کی کال پہ خود کو فاشسٹ اور متشدد سرکار کی متوقع گولیوں کے حوالے کرنے پہ تیار ہوا۔ ایسی خواتین جنکی عمریں چالیس سال تک بھی نہیں ہیں۔ اور نہ مروج سماجی مقام و سٹیٹس میں وہ کوئی خان زادیاں یا سردار زادیاں ہیں۔ ایسی خواتین جن کے پاکیزہ سیاسی موقف نے سفید ریشوں کو اُن کے ساتھ چلنے پہ آمادہ کیا، تجربہ کار اور بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والوں کو اُن کی قیادت قبول کرنے پہ ہنسی خوشی راضی کیا۔ سیاسی معجزوں میں شمار ہوگا کہ خواتین سیاسی ورکرز کی قیادت میں شرق و غرب کا بلوچ، پیرو ورنا بلوچ، مرد و زن بلوچ، قبائلی و شہری بلوچ، اور ماہی گیر و مڈل کلاس بلوچ یوں آتش فشانی ابھار کے ساتھ باہم ایک ہو گیا۔ پڑوسی اقوام میں اس کا تصور تک ناممکن ہے۔

اس ''مچی'' (اجتماع) کے لیے گوادر کا انتخاب سیاسی داؤ پیچ میں کمال مہارت کی بات تھی۔ وہ گوادر جسے معلوم نہیں ہمیشہ کے لیے فروخت کیا گیا؟ یا تیس چالیس برس کے لیے رہن رکھا گیا؟۔ اس گوادر کو واپس کلیم کرنا، اس کے مالک کے بطور بلوچ کو سامنے لانا اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کی قوت بلوچ کو قرار دینا سیاست میں کمال نہیں تو کیا ہے؟۔

مُچی کے مقام کے بطور گوادر کو سلیکٹ کرنا محض شہر گوادر کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ پورے بلوچ ساحل وسمندر کی ملکیت کا معاملہ ہے۔ ایسا اہم بلوچ علاقہ جس میں درجن سے زیادہ بندرگاہیں ہوں، جنہیں انگریز نے اپنے سامراجی مقاصد کے تحت ملکوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس پورے ساحلی وسمندری علاقے پر سو سال گزرنے کے بعد واشگاف انداز میں بلوچ ملکیت کے واحد نعرے پر سارے بلوچوں کو مجتمع کرنا سٹریٹجی اور ٹکٹکس میں ہنرمندی کا عروج ہے۔

گوادر محض ایک شہر اور بندرگاہ نہیں ہے۔ یہ پورے خطے میں گہرے سمندر کی واحد بندرگاہ ہے۔ اس ''ڈیپ'' سی رپورٹ پہ بڑے اخراجات کیے بغیر بڑے سے بڑا تجارتی بحری جہاز آ جا سکتا ہے۔

سمندر بین الاقوامی تجارت اور رسل ورسائل کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لیے گوادر نئی دنیا کے لیے بلوچ کا گیٹ وے ہے۔ اسی کی قیادت میں بلوچستان نے دنیا سے لین دین کرنی ہے۔ یوں ماہ رنگ نے نئی دنیا سے بلوچ مکالمے کی ابتدا کر دی۔ کتنا حسین تخیل ہے یہ!۔

گوادر ماہی گیروں یعنی محنت کش طبقے کا علاقہ ہے۔ یہاں مُچی منعقد کرنا محنت کی عظمت کو تسلیم کرنے اور اس کی قیادت میں چلنے کا اظہار بھی ہے۔ گوادر میں کوئی قبائلی عصبیت موجود نہیں۔ یہ کسی خان وسردار اور شہزادے کا باجگذار علاقہ نہیں ہے۔ یہ آزاد انسانوں کا علاقہ ہے جہاں کالے گورے، امیر غریب اور نام نہاد اصلی نقلی کا فرق موجود نہیں ہے۔ یہی گوادری سماج مجموعی طور پر بلوچ سماج کا مستقبل ہوگا۔ اس حقیقت کو پورے بلوچستان میں متعارف کروانا بلوچ یک جہتی کمیٹی کی تخلیقی سوچ کی معراج ہے۔

توقع کے عین مطابق اس مُچی کو ناکام کرنے کے لیے بہت فسطائیت کا مظاہرہ کیا گیا۔ ساری شاہراہیں سرکار کی طرف سے بند کر دی گئیں۔ قافلوں پہ بہت تشدد کیا گیا۔ مچی میں شرکت کے لیے جانے والے کاروانوں کو ڈائریکٹ گولیاں مار کر شہید اور زخمی کیا گیا۔ انہیں طبی سہولتوں تک پہنچنے کی راہیں بند کر دی گئیں۔ جولائی کی شدید ترین گرمی میں سایہ اور پانی سے محروم رکھا گیا۔ اندھا دھند گرفتاریاں کی گئیں۔ اور بے سروپا پُروپیگنڈہ کا نشانہ بنایا گیا۔

سراسر ناجائز:

* اس لیے کہ اجتماع کی آزادی ایک آئینی حق ہے، کسی شہری کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔
* تقریر وتحریر کی آزادی ایک بنیادی انسانی حق ہے، اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا۔
* یہ کوئی خفیہ اور زیرزمین سرگرمی نہیں ہے۔ اس کے مقاصد چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کسی بھی بہانے سے آپ اس سرگرمی کو غیر آئینی قرار نہیں دے سکتے۔
* سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جنگی کارروائی نہیں بلکہ ایک ''پُرامن'' سیاسی ایکٹوٹی ہے۔ اس میں کوئی بم بارود کی بات نہیں تھی۔ عام شہریوں کا ایک عظیم اجتماع تھا جس کے مطالبات تھے، موقف تھا، نعرے تھے، بینر اور پوسٹر تھے، ترانے اور تقریریں تھیں۔ ہزاروں مردوں عورتوں کے اس پُرامن اجتماع پہ استبدادی کریک ڈاؤن کا حکومت کے پاس کوئی جواز بنتا ہی نہ تھا۔

ایک سیاسی معاملے کو سیاسی طور پر ہی حل کرنا ہوتا ہے۔

سیاسی مسئلے کا جنگی حل بالکل موجود نہیں ہے۔

اور سیاسی حل مذاکرات کے راستے سے گزر کر جاتا ہے۔

مذاکرات کے بغیر بلوچستان کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے خواہ آپ ہزار سال تک جنگ کریں۔

ہمبوئیں سلام
LETTERS

ماہتاک سنگت کوئٹہ ۹ جولائی کو ملا۔ پڑھ کے خوشی ہوئی، ڈاکٹر شاہ محمد مری اس کے ایڈیٹر ہیں۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ اس کا سالانہ خریدار ہوں۔ اس مہینے کے شمارے پر میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس دفعہ کے کچھ مضامین نے ہمیں اتنا متاثر کیا کہ ہم نے اپنے سٹڈی سرکل میں ان کو پڑھا۔

1۔ایڈیٹوریل پیج ''مانو کہ خود سے جھوٹ بولتے رہے ہو''۔اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے طنزیہ انداز میں جس طرح ہمارے حکمرانوں کے کرتوت بتائے ہیں۔ اس ملک کے حالات کو آج یہاں تک پہنچایا ہے۔اس کی ذمہ داری محسوس کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس بجٹ پر جس کو ''جاگیرداروں ،مولویوں، پیروں، میڈیا مالکان، فوج، بیوروکریسی اور عدالت کا بجٹ ہے'' لکھا ہے۔ (یہ ایڈیٹوریل جو میرے بھتیجے۔بیٹے۔بھانجے محرم کی چھٹی پر گاؤں آئے سب کو پڑھایا). آخر میں اس مسئلے کا حل بھی بتایا ہے کہ ''منظم، باشعور اور مضبوط سیاسی انقلابی پارٹی کی قیادت میں عوام الناس کی وسیع شرکت سے ممکن ہوگا۔ اس جانب بڑھیے۔کسی مہا انقلابی کا انتظار نا کیجیے۔ اپنے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں منظم ہونا شروع کیجیے۔'' میں اس میں اپنی رائے ایڈ کرتا ہوں کہ علاقائی سٹڈی سرکل شروع کریں۔

2۔اس کے علاوہ ہم نے پولیٹیکل اکانومی ''سی آر اسلم'' کے مضمون کو بھی سٹڈی سرکل میں پڑھا۔ اس پرچے میں کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر پڑھا۔اس میں ڈاکٹر صاحب نے ہفت روزہ عوامی جمہوریت اخبار کے 30 جون 1973 سے 25 اگست تک کے شماروں کے ٹکرے دیے ہیں۔خاص طور پر اس وقت ذوالفقار علی بھٹو جو سیاسی کھیل کھیل رہا تھا۔جس کی وجہ سے فوجی اسٹیبلشمنٹ دوبارہ مضبوط ہوئی۔نعپ کی لیڈرشپ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی یاد دلادی۔

3۔ایک مضمون فیاض باقر کا اپنے کامریڈ ساتھی شمعون کی موت پر ہے۔

4۔امین کھوسو کے نام یوسف مگسی کا خط۔

اور کہانیاں شاعری بھی ہے۔اس رسالے کی ایک اچھی روایت یہ بھی ہے کہ کچھ سیاسی اور ادبی مضمون بلوچی زبان میں بھی ہیں۔

علی نواز قاضی نظامانی۔حیدرآباد

غزل

کاوش عباسی

جمال رَنگ کئی ہیں تو لُطف دار کئی
خیال ِ یار کئی ہیں ہمارے یار کئی
جِس ایک پر مِرے قُربان جان و دِل سَو بار
گُزرتے جاتے تھے واں اَیسے گُل عذار کئی
تمام گرمیاں اَچّھے دِنوں کی باتیں تھیں
پڑا جو وقت ، ہوئے ٹھنڈے شعلہ بار کئی
وہ اِنقلاب کو کہتے تھے نشّہ یار کا ہے
ہَیں اِس نشے کے اَبھی یار پُر خُمار کئی
کبھی بھی کوئی کسی تک پہنچ نہ پاتا تھا
تھے گِرد ذات کے ہر ایک کے حِصار کئی
یہ ایک دشت ہے کھو جاؤ ، پار اُتر جاؤ
بھٹک کے مَر گئے ہیں اِس میں شہسوار کئی
وفا ہے اُس میں مگر شک بھی پھُوٹتے ہیں بہت
دراڑیں رَکھتا ہے کاوش وہ خوش شعار کئی

غزل

ڈاکٹر منیر رئیسانی

ترکِ بیعت کی گھڑی آئے گی انشاء اللہ
ایک دیوار ہے ، گر جائے گی انشاء اللہ

ایک چنگاری کہ موہوم ہے جس کی ہستی
سنگ وآہن کو وہ دہکائے گی انشاء اللہ

جال بنتے ہیں جو تہہ دار سے، پیچیدہ سے
زندگی ان کو بھی الجھائے گی انشاء اللہ

بادِصر صر سے جھلستے ہیں سبھی پھول مگر
کوئی تتلی کہیں مسکائے گی ،انشاء اللہ

کرچیاں اپنی بکھیریں نہیں، تقسیم کریں
کوئی تو کام کہیں آئے گی انشاء اللہ

"اس کے دامن میں ہے بے داغ اجالے کی چمک
اور وہ صبح کبھی آئے گی انشاء اللہ "

فلسطین، عالمی ریاستی تشدد اور طلباء تحریک

سارہ علی

کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ آپ بالکل خاموش ہو جاتے ہیں ۔ان کی شدت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دلی اور دماغی طور پر زندہ باشعور انسان دکھ اور تکلیف سے نڈھال محسوس کرتا ہے۔اس وقت دنیا ایسے قتل عام کو روز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ اس کے بعد سب کچھ سوچ کا انداز زاویہ ہر چیز بدل گئی ہے۔فلسطین میں برپا قتل عام دنیا میں پہلا قتل عام نہیں لیکن یہ وہ پہلا قتل عام ہے جس کو مقتولوں نے ریکاڈ کر کے ساری دنیا کو دکھایا اور یہی وہ بنیادی فرق ہے ۔اسی طرح کا قتل عام اس وقت یوگنڈا میں جاری ہے ۔بلکہ افریقہ میں تو یہ ان انسانی حقوق کے ''علمبرداروں'' کے ہاتھوں صدیوں سے جاری ہے لیکن فرق صرف اس کے ریکاڈ اور نشر ہونے کا ہے۔اس ایک فرق نے دنیا کو بدل دیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں اپنے سامنے احتجاج کرتی اس نوجوان نسل کو جس کے گلے میں ہر وقت ہم صلواتوں کے میڈل پہناتے ہیں کہ یہ ہر وقت اپنے فونوں لیپ ٹاپوں میں گھسے ہیں ۔ان کی بدولت ہی اس نسل میں آگہی اور اتنی ہمت پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کو خطرے میں ڈال کر دنیا کی بہترین مانے جانیوالی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر نتائج کی پرواہ کیے بغیر احتجاج کر رہے ہیں۔یہ معمولی بات نہیں۔امریکہ اور کینڈا میں ایک عام انڈر گریڈ اور گریڈ سٹوڈنٹ کی زندگی سٹوڈنٹ لون سے ہزاروں ڈالر کے ڈیٹ میں دبی ہوتی ہے اور یہ لون گلے کا طوق ہوتا ہے۔احتجاج کرنے والے طالب علموں کو بخوبی علم تھا کہ ان کا احتجاج ان کے کرمنل ریکاڈ کا حصہ بنا دیا جائے گا اور ان کے اوپر اچھے مستقبل کے دروازے بند کرنے کی تمام تر کوششیں کی جائیں گی اور ایسا ہی ہوا۔

4 جولائی کو امریکہ نے اپنا یوم آزادی منایا۔لیکن اسی 4 جولائی کو اونٹاریو کورٹ نے یورنیورسٹی آف ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن کیمپس میں جاری پرو فلسطینی مظاہرے کے خلاف فیصلہ سنایا اور مظاہرین کو کنگ گرؤانڈ خالی کرنے کا حکم دیا گیا۔دو ماہ سے جاری اس مظاہرے میں ٹورنٹو یورنیورسٹی میں ہر نسل اور زبان سے تعلق رکھنے والے طلباء شامل تھے جنہوں نے اس احتجاج کو دھرنے کی شکل دی تھی اور دو سو سے زائد کیمپ لگا رکھے تھے۔کورٹ کے اس فیصلے کے بعد ان طلباء کو شام 6 بجے کا وقت دیا گیا گرؤانڈ خالی کرنے کے لیے۔نہیں تو ان کو الٹی میٹم دیا گیا کہ پولیس کے ذریعے یہ گرؤانڈ خالی کرایا جائے گا۔اس سے پہلے یورک یونیورسٹی کا احتجاجی دھرنا پولیس کے ذریعے پرتشدد طریقے سے ختم کیا گیا تھا جس میں متعدد طلباء زخمی ہوئے تھے۔ان احتجاجی دھرنوں میں صرف یہ دو تعلیمی ادارے شامل نہیں بلکہ یہ احتجاجی مظاہرے اور دھرنوں کا آغاز اپریل سے کولمبیا یورنیورسٹی سے ہوا اور اسکے بعد 130 امریکہ کی یونیورسٹیوں میں یہ احتجاجی دھرنے دیے گئے جن میں طلبا نے یورنیوسٹیوں کے گراؤنڈ میں خیمہ استادہ کیے اور دن رات وہاں رہے۔ان دھرنوں میں سوائے ایک دو واقعات کے طلبا بالکل پرامن رہے ۔لیکن یونوسٹی انتظامیہ کی طرف سے رویہ بہت جارحانہ رہا اور ان طلبا پر پولیس کی بجائے اسپیشل راؤٹ فورس بلائی گئی اور ان کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور گرفتار کیا گیا۔امریکہ میں ہونے والے ان مظاہروں اور احتجاجی دھرنوں کے اثرات کینڈا میں بھی دیکھے گئے اور کینڈا کی بیشتر یورنیورسٹیوں میں یہ احتجاجی دھرنے دیے گئے۔کینڈا میں بیشتر یورنیورسٹیوں نے مذاکرات کو ترجیح دی لیکن کچھ یونیورسٹیوں نے پولیس اور عدالت کی مدد سے اس احتجاجی دھرنے کو روکنے کی کوشش کی۔جس میں یورک یونیورسٹی اور ٹورنٹو یونیورسٹی سرفہرست ہیں کیونکہ یورک یورنیورسٹی کی انتظامیہ کو پہلے سے بے حد تنقید کا سامنا تھا کہ اسرائیل کے غزہ پر حملے کے بعد یورک یونیورسٹی کی طلباء یونین ان پہلی طلباء یونین میں شامل ہیں جنہوں نے اس حملے کی مذمت کی اور اسرائیل کو جنوبی افریقہ کے apartheid regime کے ساتھ تشبیہ دی اور اسرائیل کو ایک apartheid state کہا اور اس حملے کو جنگ نہیں genocide کہا۔یہ احتجاج اور دھرنے کہاں ہوئے اور ان میں کیا ہوا اس پر اخباروں میں رپورٹنگ ہو چکی ہے لیکن اس سارے احتجاج اور دھرنوں میں اہم یہ ہے کہ یہ احتجاجی دھرنے اپریل سے کیوں شروع ہوئے جبکہ اسرائیلی حملہ اکتوبر سے جاری ہے؟۔ان احتجاجی دھرنوں کا مقصد کیا ہے اور حکومتیں اور یونیورسٹی انتظامیہ ان سے اتنی نالاں اور ان کی طرف اتنی پرتشدد کیوں ہے؟

ان احتجاجی دھرنوں کا تعلق BDS کی تحریک سے ہے جو Ban,divest Sanctions and کا مخفف ہے۔اس تحریک کا باقاعدہ آغاز 2005 سے ہوا اور اس کو ساؤتھ افریقہ کی movement Anti Apartheid کی طرز پر تشکیل دیا گیا۔ Apartheid movement Anti کو جون 1959 میں اس وقت کی ساؤتھ افریقی کے ظالمانہ وائٹ رجیم کیخلاف لندن میں تشکیل دیا گیا تھا اور اس کے بنانے والوں میں نیلسن منڈیلا شامل تھے اور اس کا مقصد لوگوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ وہ ان اشیا کا بائیکاٹ کریں جو ساؤتھ افریقہ میں بنتی ہیں تاکہ ساؤتھ افریقہ کی حکومت کے اوپر معاشی پریشر ڈالا جا سکے۔اسی نظریے کے ساتھ BDS کی تنظیم اور تحریک کو 2005 میں تشکیل دیا گیا لیکن اصل میں اس کا آغاز 2001 میں جنوبی افریقہ میں ہونے والی World conference against racism سے ہوا

جہاں پر فلسطینی وفد کی ملاقات ساؤتھ افریقہ کی آزادی کی جدوجہد میں شامل کامریڈز سے ہوئی اورانہوں نے اس خیال کی ترویج کی کہ فلسطینیوں کو اپنے موقف کی حمایت کے لیے ایک ایسی تحریک کی ضرورت ہے جو معاشی اور کلچرل پریشر بنا سکے۔2005 میں اس کی تنظیم کے تین مقاصد بیان کیے گئے کہ اسرائیل ان تین زیادتیوں کا ازلہ کرے:

1۔ 1967 سے اسرائیل نے جن عرب علاقوں پر قبضہ کیا ہے اس کو ختم کرے اور دیوار جو غزہ ویسٹ بنک اور اسرائیلی علاقوں کے درمیان بنائی گئی ہے اس کو ختم کرے ۔

2۔ تمام فلسطینی عرب جو اسرائیل میں رہ رہے ہیں ان کو عام یہودی اسرائیلیوں کی طرح کے مساوی حقوق دیے جائیں۔

3۔ فلسطینی مہاجروں کو واپسی کا حق دیا جائے ۔اس پیغام کو لیفٹ اور فلسطین کے پڑھے لکھے طبقوں سے پذیرائی ملی اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جو طریقہ کار وضع کیا گیا وہ ان اشیاء کا بائیکاٹ تھا جو اسرائیل میں بنتی ہیں اور ان کمپنیوں کا بائیکاٹ تھا جن سے اسرائیلی حکومت کو منافع ملتا ہے کہ اس کا فائدہ ان کی فوج کو پہنچتا ہے، دوسرا اس تمام تعاون کا خاتمہ ہے جو امریکہ کینڈا یورپ کی یونیورسٹیوں کا اسرائیلی یونیورسٹیوں سے ہے اور تیسرا اسرائیل پر تجارتی پابندیوں کا مطالبہ ہے تا کہ ہتھیاروں کی خریدنے کی اسرائیلی طاقت کی روک تھام کی جا سکے۔یہ ایک لمبا اور تکلیف سے بھرا ہوا عمل ہے لیکن اس کے اوپر 2005 سے کام کیا جا رہا ہے اگرچہ اس کو تنقید کا سامنا رہا ہے لیکن بہت سی امریکی اور یورپی یونیورسٹیوں کی طلبا تنظیموں میں کئی بار یہ قراردادیں پیش کی گئیں کہ یونیورسٹیوں کو اپنی آمدنی اور اثاثوں کو پبلک کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ طلباء کے پیسے ہیں اور ان کو کسی بھی قوم کے اوپر ظلم ڈھانے کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ساتھ ہی ان قراردادوں میں مطالبہ کیا گیا کہ یونیورسٹیوں کو ان تمام کمپنیوں میں انوسٹمنٹ ختم کرنے کی ضرورت ہے جن کا تعلق اسرائیل سے ہے۔2009 میں Hampshire college پہلا امریکی کالج تھا جس نے اسرائیلی کمپنیوں سے divestment کا اعلان کیا۔2010 میں UC Berkeley کی طلباء یونین نے یہ قرارداد منظور کی اگرچہ یونیوسٹی نے ماننے سے انکار کر دیا۔کافی ساری یونیورسٹیوں میں صرف اس بارے میں قرارداد اسٹوڈنٹ یونین کی باڈیز میں پاس کروانے کے لیے دو دہائی کا عرصہ لگا یورنیورسٹی آف مشیگن میں 2002 سے اس مقصد کے لیے کام کیا گیا اور 2017 میں یہ قرارداد گیارہویں دفعہ میں یونیوسٹی کی تاریخ کی طویل ترین بحث کے بعد سٹوڈنٹ یونین نے اسرائیل سے divestment کی قرارداد پاس کی۔ جس کو بورڈ آف گورنر نے مکمل طور پر رد کر دیا۔کولمبیا یونیورسٹی میں لیفٹ سے تعلق رکھنے والے سٹوڈنٹ اور اساتذہ نے اس مقصد کے لیے 2002 سے مہم اور قراردادوں کا آغاز کیا اور 2020 میں ان کو پہلی کامیابی ملی جب سٹوڈنٹ یونین نے اس قرارداد کو منظور کیا جسکو کولمبیا یونیورسٹی کی گورننگ بوڈی نے رد کر دیا۔

یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے اس لمبی اور پرخطر جدوجہد کی جس کے مناظر دنیا نے اپریل میں دیکھے۔لیکن یہاں اس بات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ اساتذہ اور طلباء جنہوں نے احتجاج کیا انہوں نے انتہائی پرخطر ماحول میں اس کام کا بیڑہ اٹھایا کہ یونیورسٹی اور پورا یورپ امریکہ کینڈا انتہائی سخت گیر حساس اداروں کے ذریعے ان کی مانیٹرنگ کریں گے۔ ان کے کریمنل ریکاڈ بنائیں جائیں گے اور لون میں دبے ہوئے طلبا کی خاص کر زندگی مشکل کر دی جائے گی اور اساتذہ پہ ترقی اور نوکریوں کے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔اپنی بے پناہ جنگی طاقت اور اندھا دھند قتل عام کے بعد بھی اسرائیل اور زیونسٹ یہودی ایک لفظ اپنے خلاف سننے کو تیار نہیں۔ان کی ایروگنس کا یہ عالم ہے کہ ان کے غرور کو گوارا نہیں کہ جن انسانوں کو وہ چیونٹیوں کی طرح روند رہے ہیں وہ اپنے حق میں یا کوئی ان کے حق میں اور اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائے۔ایک طرف قتل عام جاری ہے اور دوسری طرف صرف آواز اٹھانے سے ان کے احساسات مجروح ہوتے ہیں اور یہ اپنے آپکو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں۔

اپریل کا انتخاب اس تحریک کے مظاہروں اور احتجاج کے لیے اس لیے کیا گیا کہ اس مہینے سے یونیورسٹیوں میں گریجویشن کی تقاریب کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہ سال کی سب سے بڑی تقریب ہوتی ہے جس کا پورے شہر کو انتظار ہوتا ہے۔اس لیے نہ صرف ان احتجاجی دھرنوں کا آ آغاز کیا گیا بلکہ گریجویشن کے دوران بھی سٹوڈنٹس نے اپنی تقریر کے دوران سخت الفاظ میں اسرائیل کے ظلم کی مذمت کی اس کو ایک apartheid state اور اس کے قتل عام کو genocide قرار دیا۔اس کا مقصد نہ صرف اسرائیل کے مظالم کی مذمت تھی بلکہ ان فلسطینی نوجوانوں کو یاد کرنا تھا جنہوں نے 2024 میں گریجویٹ کرنا تھا اور ان سب کو مار دیا گیا، ان اساتذہ کو یاد رکھنا تھا جن کو فلسطین میں قتل کر دیا اور دنیا کو فلسطین اور اس کے اوپر جاری مظالم سے آگاہ کرنا تھا کہ آج کی دنیا میں سب سے طاقتور میڈیا سوشل میڈیا ہے اور اسپر اپنی آواز اجاگر کرنے کا اس سے بہترین موقع دستیاب نہیں ہونا تھا۔اس کے ذریعے divest Ban, اور sanctions کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانا تھا کہ ہم نے دیکھا کہ کس طرح سے Starbucks کو اس بائیکاٹ کی وجہ سے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔اپنی بھرپور طاقت اور absolute اتھارٹی کے باوجود اسرائیل ،امریکہ انتہا پسند رائٹ ونگ اور زیونسٹ ان طلباء سے اور اساتذہ سے سخت نفرت کرتے ہیں ان کے لیے مسئلہ صرف فلسطین پر آواز اٹھانے کا نہیں بلکہ ان اساتذہ اور طلباء کی سوچ کی وسعت ، گہرائی ، ہمت استقامت دلیری اور انسان دوستی ہے۔ان کو ان کے نظریات میں کارل مارکس کی بو اور ساری دنیا کے مظلوموں کی حمایت سے ان کے دماغوں میں چے گویرا بسا نظر آتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں اس دفعہ سوشل میڈیا کا ہتھیار ہے جس سے وہ کیپٹلزم ،فری اکانومی ، نام نہاد انسانی حقوق کے دعوں اور فریڈم آف سپیچ کے جھوٹ کے پرخچے اپنے علم

اور قابلیت سے اڑا رہے ہیں۔اس سب میں کہیں مذہب اور قومیت نہیں ان کے لیے بچے کی طرح سارے مظلوموں کے لیے ہمدردی اور آواز اٹھانے کا جذبہ ہے اور پوری دنیا کا علم ان کی انگلیوں کی کلک میں ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ بیشتر ممالک جہاں اس قسم کے سخت حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا وہاں ہمیں مکمل خاموشی نظر آتی ہے۔اسلام کے لیے جہاد کو ساری دنیا میں ایکسپورٹ کر کے خود جنت کے مزے لوٹنے والے عرب ممالک میں کوئی احتجاج نہیں، نہ ہی حج کے موقع پر کوئی آواز کوئی خطبہ اس ظلم کے خلاف آیا حالانکہ بلین ڈالر اس سے سعودی عرب نے کمایا ہے۔نہ ہی افغانستان کو اسلام اور جہاد کے نام پر تباہ کرنے والے پاکستان میں ہمیں ایک مستقل احتجاج نظر آیا۔بات پھر ان سرپھرے جوانوں تک جا پہنچی جن کے کندھوں سے سر اتارنے کو مذہب اور رائیٹ ونگ دونوں مشتاق رہتے ہیں اور ان کو رہا سہا crucify کیپٹیلزم کی مرتی ہوئی اکانومی اور سہولیات کی عدم دستیابی کر رہی کہ بقول نورمن فریکسٹائن ''میں ان نوجوان طلباء کے حوصلے کی داد دیتا ہوں ان کو بے تحاشا مسائل کا سامنا ہے۔کلائمیٹ چینج، نوکریوں کی عدم دستیابی اور غیر یقینی مستقبل کے درپیش چیلنج میں ان کے پاس احتجاج نہ کرنے کے لیے ایک ہزار کاز موجود تھے لیکن انہوں نے فلسطین اور غزہ کو اپنے احتجاج کے لیے منتخب کر کے اپنی انسان دوستی کا ثبوت دیا۔ان کی ہمت کو میں سلام کرتا ہوں''۔نورمن فرینکسٹائن 70 سال کے یہودی امریکی پولیٹیکل سائنس کے مایہ ناز استاد اور سیاسی کارکن ہیں جنہوں نے ساری عمر اسرائیل کی جارحیت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔امریکہ کینڈا اور یورپ کا لیفٹ اور نوجوان تمام تر مشکلات، ہراسمنٹ اور سرویلنس کے بعد بھی احتجاج کر سکتا ہے تو پاکستان میں بھی کر سکتے۔اب نہیں تو کبھی نہیں۔یہ یاد رکھا جائے گا کہ فلسطین میں جنگ روکنے کے لیے مسلمان ممالک یا سعودی عرب نے اسرائیل کو انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس میں نہیں گھسیٹا تھا بلکہ یہ ساؤتھ افریقہ تھا جس نے اسرائیل کے مظالم اور فلسطینیوں کی نسل کشی کے خلاف اسرائیل کو برسرعام چیلنج کیا اور ان کے وکیلوں نے بدترین اسرائیلی دھمکیوں کا سامنا کیا۔یہ مار کھاتے اساتذہ اور نوجوان بچے اس دنیا کی آخری امید ہیں کیونکہ ہم نے اس نوجوان نسل کے لیے فلسطین میں صرف فلسطینوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا بلکہ خدا، مذہب، انسانیت اور محبت کا بھی قتل عام کیا ہے۔خاموش رہ کر اپنی اپنی زندگیوں میں مگن رہ کر ۔

''نئی دنیا وہ لوگ نہیں تشکیل دیتے جو ہاتھ باندھ کر ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنے سامنے ہونے والی نظریاتی لڑائی کو تماش بین کی طرح دیکھتے ہیں بلکہ وہ لوگ تشکیل دیتے ہیں جو مقابلے میں اترتے ہیں۔جن کے کپڑے اس لڑائی میں تار تار ہو جاتے ہیں اور جن کے جسم اس نظریے کی لڑائی میں لہولہان ہو جاتے ہیں''(نیلسن منڈیلا)

اگر مجھے لازماً مرنا ہے
تو تم زندہ رہو
تاکہ میری کہانی سنا سکو
میری چیزیں بیچ سکو
اور کپڑے کا ایک ٹکڑا
اور کچھ دھاگے خرید سکو
اور پتنگ بناؤ
وہ سفید ہو
اور اس کی لمبی سی دم ہو
تاکہ غزہ میں کوئی بچہ
آسمان کی طرف تکتے ہوئے
اسے دیکھے
جب وہ اپنے باپ کا انتظار کر رہا ہو
جو اس برستی ہوئی آگ میں
اپنے پیاروں کو خدا حافظ کہے بغیر مار دیا گیا
وہ بچہ یہ پتنگ دیکھے
میری پتنگ
آسمان میں اونچی اڑتی ہوئی
اور ایک لمحے کو اسے لگے
کہ کوئی فرشتہ محبت کا پیغام لے کر
زمین پر اتر رہا ہے
اگر مجھے لازمی مرنا ہے
تو میرا مرنا کسی کے لیے امید کا پیام بنے
ایک کہانی بنے
(رفعت العریر)

محنت کشوں کے نام

لالہ رخ لالہ

مرے وطن کے بہار چہرو
مرے وطن کے نکھار چہرو
تمہارے ہاتھوں مشقتیں ہیں
تمہارے دم سے یہ رونقیں ہیں

قدم قدم پر ہنر تمہارا
بنا ہے لوگوں کا اک سہارا

تمہی سے رونق تمہی سے مستی
گلی گلی بھی کھلی کھلی سی
کسان زادو, زمیں کے بیٹو
وقار ہستی کے تم امیں ہو
مری یہ نظمیں مرے فسانے
رہیں ادھورے بنا تمہارے

تمہی سخن ہو تمہی خموشی
تمہی ترانوں کی دلکشی ہو
مرے وطن کے سنگھار چہرو
مہکتے، کھلتے گلاب چہرو
محاذ سارے سنبھال کر تم
حقوق دامن میں ڈال کر تم
قدم بڑھاو اے جاں نثارو
بنو محافظ، بشر بچاو

کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر

شاہ محمد مری

15 مارچ 1974 میں عوامی جمہوریت کے بجائے اس سائز اور صورت میں ''پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا خبرنامہ'' چھپا جس کے ایک کونے میں ''سرکلر نمبر 2۔ صرف پارٹی کارکنوں کے لیے'' لکھا تھا۔ چار صفحات کی اس اشاعت میں پہلا مضمون ''بنکوں کو قومیانے کے معیشت پر اثرات'' کے عنوان سے ہے۔ تفصیلی، معلوماتی اور تجزیہ سے بھرا مضمون۔ اس کے اگلے صفحے کے چوکھٹے پہ یہ درج ہے:

''عوامی جمہوریت زندہ رہے گا

''عوامی جمہوریت میں ایک مضمون ''خدارا وطنِ عزیز کو بچایئے'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس مضمون میں بلوچستان میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ سیاسی مسائل کا سیاسی حل ہونا چاہیے۔ اس مضمون کو ایک ہینڈ بل کی صورت میں شائع کر کے پاکستان بھر میں تقسیم کیا گیا۔ اس مضمون کی اشاعت کی بنا پر مطلبی فرید آبادی، سی آر اسلم، خواجہ رفیق، اسلم اعوان اور دیگر کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ درج ہوا۔ اس کے بعد ایک اور مقدمہ ''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے'' اور ''پاکستان خوشحال کیسے'' کے عنوان سے چھپنے والے مضامین کی بنا پر خواجہ محمد رفیق پر قائم ہوا۔ وہ سترہ روز تک جیل میں رہے اور پھر ضمانت ہوئی۔

ان کے ساتھ ہی عوامی جمہوریت کی اشاعت روک دی گئی اور اب کئی ماہ سے رسالہ بند ہے اور اس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ رسالہ 8 ستمبر 1973 سے بند رہا۔

دوسرا اہم مضمون ''عورتوں کا بین الاقوامی دن'' ہے۔ اگلا مضمون اس قدر اچھا ہے کہ میں اس کے عنوان ہی سے متاثر ہو چکا۔ بس یہی عنوان ہی کافی ہے: ''غربت اور افلاس کے اسباب کا شعور عوام کی جدوجہد کے لیے ضروری ہے''۔ آخری مضمون فلسفہ پر ہے، جدلی فلسفے کے اصول کے نام سے۔

22 فروری 1974 کا پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا خبر نامہ ملتان ڈویژن کے سوشلسٹوں کے کنونشن کی رپورٹ پر مشتمل ہے۔ سی آر اسلم ایک بہت تخلیقی اور محنتی لیڈر تھا۔ اس کی سربراہی میں پارٹی کا ترجمان اخبار عوامی جمہوریت سرکار نے بند کر دیا تھا۔ تب اس نے ہر وہ کوشش کی کہ اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔ اسی خبر نامے کے اولین صفحے پر 23 مارچ 1974 کو موضع ٹانڈہ ضلع کیمبلور میں ''کسان کانفرنس'' منعقد کرنے کا اعلان موجود ہے۔ ایک مضمون ''بنکوں کو قومی تحویل میں لینے سے ملکی معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے'' کے عنوان سے ہے۔ اس کا ایک صفحہ پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کی سرگرمیوں کے لیے وقف ہے۔

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا سرکلر (صرف ممبران کے لیے) کے اسی سلسلے کا اگلا چار صفحاتی اخبار تاریخ کے بغیر چھپ گیا۔ پبلو نرودا پہ ایک خوبصورت مضمون دیا گیا ہے۔ ایک نظریاتی مضمون ''آبادی اور خوراک کی فراہمی کا مسئلہ'' ہے۔ اخبار نے اس بات کی حمایت کی کہ ''اولیت معاشی ترقی کے پروگرام کو دی جائے اور سماج کے سب افراد کے لیے روزگار مہیا کیا جائے''۔ اس شمارے میں ایک مضمون بلغاریہ میں سوشلزم کی کامیابیوں پہ چھپا ہے۔

پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی دو روزہ ڈویژنل لیبر کانفرنس کی رپورٹ پہ 15 ستمبر کی تاریخ سے لگتا ہے کہ یہ شمارہ ستمبر کے اواخر یا اکتوبر 1974 کے اوائل میں چھپا ہوگا۔

اور اب وہ شمارہ جس نے بھٹو اور اسٹیبلشمنٹ کو سخت ناراض کیا۔ شمارہ ہے 9 جون 1973 کا اور مضمون کا نام ہے: ''خدارا وطن عزیز کو بچایئے۔

''خدارا وطن عزیز کو بچایئے

''پاکستان آج جن سیاسی بگولوں کی زد میں ہے اپنی 27 سال کی زندگی میں اسے ان سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ گو یہ درست ہے کہ اس کے حکمران سیاست والوں نے بار بار اسے داؤ پر لگایا اور آخری داؤ ایسا ہارا کہ پانچ کے بجائے صرف مغربی پاکستان کے چار صوبوں اور 13 کروڑ انسانوں کے بجائے چھ کروڑ انسانوں کے نام کے ساتھ پاکستان لگا باقی رہ گیا تاہم یہ سیاسی طوفان تھے بگولے نہیں تھے جن کا آغاز پیپلز پارٹی کے اقتدار سے ہوا ہے اور جو بار بار رہے ہے پاکستان کو ختم کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے مخالفوں پر حملے، قتل اور ان پر جھوٹے مقدمات بنانا، ان کے جلسوں پر گولیوں پتھروں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر کے اعلان کرنا کہ مخالفت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ پٹھانوں اور پنجابیوں کو لڑانے کے لیے اہل پنجاب کو مشتعل کرنے کی کوشش کرنا مخالفت جماعتوں کے جلوسوں اور پریس کانفرنسوں پر منصوبہ بند حملے اور پھر آگے بڑھ کر ان صوبوں میں جہاں پیپلز پارٹی کا وجود برائے نام ہے نمائندگان کا اعتماد رکھنے والی جمہوری حکومت کو برطرف کرنا، منتخب نمائندگان کو وزارتوں اور ملازمتوں کی رشوتیں دے دے کر توڑنا، مشرقی پاکستان کے شرمناک تجربے کے باوجود بلوچستان میں پاکستانی فوج کے ہاتھوں پاکستانی عوام کو نشانہ بنانے کے لیے فوج کشی کرنا، نام نہاد کشمیر کے صدر کو برطرف کرنے کی دھمکیاں دینا، جس کے متعلق کشمیری عوام کا تو ذکر ہی کیا خود ہمارے پچھلے اور موجودہ حکمران یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ وہ کشمیر کی آزاد مملکت کا حصہ ہے یا پاکستان

کا۔ سیاست کے یہ وہ بگولے ہیں جن کے لیے پاکستان کی جڑیں قومی سطح پر ہلائی جارہی ہیں ۔جس کے متعلق بقول امریکہ کے نیوزویک بعض لوگوں کی پیشنگوئی ہے کہ اس کا بھٹہ بیٹھنے والا ہے اور بین الاقوامی سطح پر سامراجی امریکہ کے علاوہ ایران، سعودی عرب کے بادشاہوں اور متحدہ عرب امارتوں کے عوام دشمن حکمرانوں کے دوروں پر جبیں سائی کی جارہی ہے تاکہ تیل کی رائلٹی سے حاصل ہونے والے ان کی خزانوں کے کچھ بھورے ہاتھ لگ جائیں۔ اس جبیں سائی سے عالمی سطح پر صرف پاکستان کی عزت نفس کو ہی ختم نہیں کیا جارہا ہے بلکہ ایسی سودے بازی کی جارہی ہے جس کا مقصد ایران، عرب اور خود پاکستان کی ابھرتی ہوئی آزادی کی عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لیے پاکستانی فوجوں سے وہی کام لیا جائے جو کام برطانوی سامراج ایشیا و افریقہ کو غلام بنانے کے لیے لیتا رہا تھا۔

لوٹ آئے گا

رخشندہ نوید

دل کی چھت پر دن ڈھلتے ہی
ایک پرندہ بول رہا ہے
اڑنے کو پَر تول رہا ہے
اپنے بکھرے بال سمیٹو
پوروں پر دن گننا چھوڑو
سکھ سے اپنا رشتہ جوڑو
صبحیں، دوپہریں اور شامیں
مدغم ہوتے چاند اور سورج
دریا پار کرن کی ناؤ
ساحل پر ڈیرا ڈالے ہے
جھلمل کرتے سرخ دوپٹے کی تہہ کھولو
آج تو اپنے آئینے سے ہنس کر بولو
پریتم کا سندیس آیا ہے
وہ بھی اک دن لوٹ آئے گا

(اوکتاویو پاز کی نظم As One Listens to the rain پڑھنے کے بعد)

غنی پہوال

میں نے تُم کو سُنا
جیسے پانی منکشف ہوتا ہے
جیسے زمین،
مجذوب سی سرشاری میں لپٹی ہوئی
اپنی پیاس کو گلے لگاتی ہے
میں نے تُم کو سُنا
اور میری سماعت جاگ گئی
جیسے بارش کی بوندیں پڑنے کے بعد
مٹّی کی سوئی ہوئی خوشبو بیدار ہوتی ہے
میں نے تُم کو سُنا
جیسے پانی مجھ سے مخاطب ہو
بالکل اسی طرح
جیسے تمہاری خوشبو کی آنکھ
مجھے ڈھونڈتی ہے
دن اور رات سے بے نیاز ہو کر
میں نے اسی طرح
آوازوں سے بے نیاز
تُم کو سُنا

میں نے تُم کو سُنا
اُس وقت جب سارے حروف
اور سب علامتیں
طوفانی ہواؤں کی زد میں تھیں
اور خیالات بادلوں کی طرح
ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے
اور میں اپنے وجود کے دوراہے پر
تنہا کھڑا تھا
میں نے تُم کو سُنا
جیسے کوئی دروازہ کسی دستک کو سُنتا ہے
جیسے ڈھند پُل عبور کرتی ہے
جیسے کوئی جھونکا
کسی مخصوص شاخ کو چھیڑنے کی غرض سے
جنم لیتا ہے
میں نے تُم کو سُنا
اور میری تطہیر ہو گئی

غزل

ڈاکٹر رضوان علی

نذرِ غالب

دل کو دَم سادھ کے سنا کیجئے
پھر کہے جو وہی کیا کیجئے

آپ کا دل جو مضمحل ہو کبھی
میرے حصے کا رُو لیا کیجئے

ٹوٹ کر گر چکے ہیں ہاتھ مرے
آپ میرے لیئے دعا کیجئے

یوں مجھے زندگی نہیں کرنی
میرے حصے کا فیصلہ کیجئے

حرف خود راستہ بنائیں گے
اپنے اندر کا دکھ لکھا کیجئے

شعر تازہ رہیں گے غزلوں میں
ہر گھڑی ٹوٹتے رہا کیجئے

ہم تو بس آپ سے مخاطب ہیں
''آپ سنتے نہیں تو کیا کیجئے''

سنگت اکیڈمی: جہدِ مسلسل کا استعارہ

جاوید اختر

یوں تو سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا قیام 1997ء میں ہوا مگر اس کی تاریخی و نظریاتی بنیادیں 1920ء کی ینگ بلوچ تحریک میں پیوست ہیں۔ جسے میر عبدالعزیز کرد نے شروع کیا اور یوسف عزیز مگسی نے آگے بڑھایا۔ یہی وہ تحریک ہے، جو ہماری طبقاتی جنگ، قومی جمہوری تحریکِ آزادی اور صنفی جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ نقطۂ آغاز اس مفہوم میں کہ یہیں سے ہماری تنظیم سازی شروع ہوئی، جس میں شامل ڈسپلن، نظریہ، ٹیکٹس، طریقِ کار، جلسہ، جلوس، تحریر و تقریر، پمفلٹ، منشور و آئین اور قرارداد وغیرہ ایسی چیزیں تھیں، جو ماضی کی تحریک میں مفقود تھیں۔

ورنہ تو طبقاتی، قومی اور صنفی جبر و ستم اور ظلم واستحصال کے خلاف بلوچستان میں ہمیشہ مورچہ بندی اور معرکہ آرائی جاری وساری رہی ہے۔ بلوچوں نے ہر بیرونی حملہ آور کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔ تاریخ معلومہ میں ہمیں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں، جب بلوچوں نے بیرونی دشمنوں کا بڑی جواں مردی اور دلیری سے مقابلہ کیا اور انہیں منہ توڑ جواب دیا۔ مثال کے طور پر سولہویں صدی میں یہاں بلوچستان کے ساحل پر حمل جیئند اور اس کے لشکر کی پرتگالی سامراج کے خلاف جنگ کا منظر دکھائی دیتا ہے، جس میں انہوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حمل کی باغیانہ بلوچی شاعری حمل اور اس کے ساتھیوں کی جانثاری کی داستان سناتی ہے۔

اسی بلوچی شعری روایت نے بعدازاں رحم علی مری، گدو ڈومب، حسن رئیسانڑیں اور ملامزار بدوزئی کی باغیانہ شاعری کے لیے راستہ ہموار کیا، جو برطانوی سامراج کے خلاف وجود میں آئی۔ یہ شاعری نہ صرف برطانوی سامراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ بل کہ اس کی سامراجی پالیسیوں کو چیلنج بھی کرتی ہے۔ یہی شاعری بعد میں بہت سی Qualitative اور Quantitative تبدیلیوں سے گزر کر مزید شان دار ہوگئی۔

ملامزار بدوزئی، رحم علی مری، ملا فاضل اور جواں سال بگٹی نے بلوچی شاعری میں قومی موضوعات کے ساتھ ساتھ طبقاتی عنصر کا بھی ضافہ کر دیا۔ ملامزار بدوزی نے چار زبانوں (بلوچی، اردو، سندھی اور براہوئی) میں اپنی مشہور نظم ''لاٹہ بگھی'' لکھ کر برطانوی سامراج اور اس کے افسر کی بگھی کھینچنے والے سرداروں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کا نقطۂ نظر طبقاتی ہے۔

دریں اثنا 1920ء میں ابھرنے والی ینگ بلوچ تحریک ان ہی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اس نے ان سب قومی، طبقاتی، جمہوری اور سوشلسٹ روایات کو نہ صرف اپنے اندر جذب کیا بل کہ انہیں ترقی بھی دی۔ یہ حقیقت ہے کہ جمہوریت، آزادی اور سوشلزم ایسے آئیڈئل اسی تحریک کی دَین ہیں۔ یہ تحریک بیک وقت دو محاذوں پر برسرِ پیکار رہی۔ ایک طرف اس نے برطانوی سامراج سے قومی جنگ لڑی اور دوسری طرف خانِ قلات کی فیوڈل ریاست کے خلاف طبقاتی جدوجہد کی۔

خانِ قلات کسان رعیت کی مشقت کا مرہونِ منت تھا اور اس کے درباری سردار بھی اپنے اپنے بزگروں کے خون پسینے پر عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس بڑی تحریک نے کسانوں کی نمائندگی کی اور خان اور سرداروں کے خلاف طبقاتی جدوجہد شروع کی۔ اس تحریک نے قومی، طبقاتی اور صنفی مسائل کی بنیاد پر اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک 1935 کے بعد تک بلوچستان کے سیاسی تناظر پر غالب حیثیت سے چھائی رہی۔ 1940ء تک اس تحریک کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر 1950ء کے عشرے میں لٹ خانہ کے نام سے تحریک ظہور پذیر ہوئی اور اس نے ایک ادبی تنظیم بلوچی زبان وادبہ دیوان کو جنم دیا۔

اسی دوران میں 52-1951ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بلوچستان شاخ قائم ہوئی۔ اس میں بلوچستان کی ہر زبان کے ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا۔ 1954ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین پر حکومت نے پابندی عائد کردی تو اُس کی جگہ پر 1967ء میں پاکستان بھر کے ترقی پسند دانش وروں نے عوامی ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔ 1980ء کی دہائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بلوچستان شاخ دوبارہ بحال ہوئی اور وہ کافی سالوں تک افتاں وخیزاں کام کرتی رہی لیکن کوئی اثرات مرتب نہیں کرسکی۔ کیوں کہ وہ بلوچستان میں موجود قومی سوال کو طبقاتی مسئلہ کے ساتھ مربوط کرنے میں ناکام رہی۔ اس لیے ایک ہمہ گیر ادبی تنظیم کی ضرورت درپیش آئی، جو صحیح معنوں میں بلوچستان کی نمائندہ ہو۔

چناں چہ کچھ دوستوں کی کوششوں سے سنگت کے پیش رو تنظیم کے بطور لوز چیذغ کے نام سے ایک تنظیم منظرِ عام پر آئی۔ یہ تنظیم 1997ء تک قائم رہی، تب ماہنامہ سنگت کی نسبت سے سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ تنظیم دراصل مذکورہ بالا تمام ترقی پسند تاریخی، سیاسی، جمہوری، قومی اور سوشلسٹ روایات کا تاریخی و جدلیاتی انجذاب synthesis ہے۔ یہ تنظیم وقت کی اہم ضرورت تھی۔ کیوں کہ حبس زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہی حیات آفریں ہوتا ہے۔ اس کا ظہور ایک ایسے دور میں ہوا، جسے دورِ رجعت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جب

عالمی محنت کش تحریک بہت بڑی تاریخی پسپائی کے بعد خود کو سنبھالنے اور سمیٹنے میں مصروف تھی۔ ترقی پسند قوتوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور دنیا یونی پولر کیپٹلزم کے سخت شکنجے میں جکڑی جارہی تھی۔ ہر طرف رجعت، دہشت اور بنیاد پرستی کا بدمست شیطان رقصاں وفرحاں تھا۔

ان کڑے حالات کی تیز آندھی کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کے چراغ گل ہوگئے اور انہوں نے جابروں، غاصبوں اور سامراجوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز ایسے ماحول میں ترقی پسند قوتوں، مزدوروں، مظلوم قوموں اور بے بس عورتوں کے لیے امید کا ستارہ بن کر ابھری۔ سنگت نے ابتدا میں بہت ہی مختصر سی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا، بعدازاں لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ یوں سنگت اکیڈمی سنگین حالات میں ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی حکمتِ عملی کے تحت اپنے تاریخی ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی۔ علاوہ ازیں اس نے بہت سے نشیب و فراز بھی دیکھے ہیں۔ لیکن اپنا سفر مسلسل جاری رکھا ہے اور وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

اس میں نظریے کی زیادہ سے زیادہ سرایت نے اس کی انقلابی جہت کو متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد سنگت میں شامل ہوتی گئی۔ اس طرح سنگت اکیڈمی تطہیری عمل سے گزرتی رہی اور اس میں وہ تمام عناصر فلٹر ہوتے گئے، جو اس کے تاریخی ونظریاتی ارتقا میں مزاحم تھے۔ ان کی جگہ نئے عناصر لیتے رہے، جو اس کے لیے کارآمد اور مفید تھے۔ سنگت میں تنقید وخود تنقیدی کا عمل ہمیشہ جاری رہا، جو اس کی Democratic Centralism پر دلالت کرتا ہے۔

چناں چہ اپنے تاریخی ارتقا کے دوران میں سنگت کا تنظیمی ڈھانچہ کئی ایک تبدیلیوں سے گزرا ہے۔ بالآخر اس نے اپنا ایک بے مثال تنظیمی ڈھانچہ، ڈسپلن، منشور و آئین اور طریقِ کار وضع کرلیا ہے۔ سنگت کی رکنیت اس وقت 45 تک پہنچ چکی ہے۔ سنگت کا تنظیمی ڈھانچہ، اسی ڈیموکریٹک سنٹرل کی بنیاد پر قائم ہے۔

سنگت ہر ماہ کے پہلے اور آخری اتوار دو مختلف نشستوں کا اہتمام کرتی ہے۔ ہر ماہ کے آخری اتوار کو پوہ زانت کے نام سے سنگت کے سیکرٹری جنرل کی زیرِ صدارت ایک نشست ہوتی ہے۔ پوہ زانت کی اس نشست میں میں سائنسز، سوشل سائنسز، فن وادب، کلچر، سیاست، فلسفہ، مارکسزم، تاریخ، اینتھراپولوجی اور آرکیالوجی کے موضوعات پر لیکچر، مضمون و مباحث، سنگت ایڈیٹوریل، افسانے، کتابوں پر تبصرے، کثیر اللسانی شاعری اور قراردادیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ اجلاس صدرِ مجلس کے خطاب کے بعد اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس میں شاعر، ادیب، دانشور، مزدور رہنما، کسان رہنما، طلبا وطالبات کی اچھی خاصی تعداد شریک ہوتی ہے۔ پوہ زانت جہاں فکری، نظریاتی اور ادبی تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے وہاں یہ طبقاتی شعور کی فراہمی کا بھی بہت بڑا پلیٹ فارم ہے۔

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کا دوسرا ماہانہ اجلاس، جو ہر ماہ کے پہلے اتوار کو منعقد ہوتا ہے، وہ بلوچستان سنڈے پارٹی ہے۔ بلوچستان سنڈے پارٹی ایک بہت بڑا ماس فرنٹ ہے، جس میں شاعر، ادیب، دانش ور، سیاست دان، ٹریڈ یونین ورکرز، کسان رہنما، طلبا اور طالبات شامل ہوتے ہیں۔ یہ اکٹھ پہلے جمعہ پارٹی، پھر سنڈے پارٹی اور اب بلوچستان سنڈے پارٹی کہلاتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ محمد لکھتا ہے:

''ہم نے کوئٹہ میں ایک نیم سماجی، نیم ادبی، نیم ثقافتی اور نیم سیاسی پارٹی قائم کرلی، جس کا نام پہلے BJP تھا، ''بلوچستان جمعہ پارٹی'' لیکن بعد میں جب نواز شریف نے جمعہ ختم کرکے چھٹی اتوار کو کرلی تو ہم نے بھی اپنی پارٹی کا نام تبدیل کرکے BSP (بلوچستان سنڈے پارٹی) رکھ دیا۔''(1)

بلوچستان سنڈے پارٹی کا اجلاس ہر ماہ کے پہلے اتوار کو پروفیشنل اکیڈمی شیر محمد روڈ کوئٹہ میں باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتا ہے۔(2)

بلوچستان سنڈے پارٹی کے اجلاس میں حالاتِ حاضرہ اور قومی و عالمی صورتِ حال پر غیر رسمی، بے تکلف اور عموماً غیر تحریری مگر کبھی کبھی تحریری بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں انسان، سماج، تاریخ اور کائنات الغرض ایٹم کے معمولی ذرے سے لے کر کہکشاں تک محیط موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھار لیکچر بھی دیے جاتے ہیں اور قراردادیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ یہ قومی، طبقاتی اور صنفی شعور فراہم کرنے کا بہت بڑا پلیٹ فارم ہے۔

سنگت نے دورانِ جدوجہد بلوچستان کے کلچر میں پہلے سے موجود قومی جمہوری اور سوشلسٹ روایات کی ترویج واشاعت کی ہے اور اسے عالمی جمہوری اور سوشلسٹ کلچر سے ہم آہنگ کیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر سنگت نے بلوچستان کو مارکسزم سے مربوط کیا ہے۔ اس سلسلے میں سنگت نے' پیپلز ہسٹری آف بلوچستان' سیریز کی تکمیل کی ہے۔ 'عشاق کے قافلے' سیریز، جو بلوچستان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے چیدہ چیدہ انقلابی جانثاروں کی بائیوگرافیکل سیریز ہے، کو مکمل کیا ہے۔ سنگت نے بلوچی زبان وادب کی تاریخ کو جدلیاتی و تاریخی مادیت کی روشنی میں تحریر کرکے ایک سیریز کی شکل میں شائع کرکے عام قاری تک پہنچایا ہے۔ علاوہ ازیں سنگت نے پیپلز آلٹرنیٹو ایجوکیشن پالیسی اور پیپلز آلٹرنیٹو کلچر پالیسی بھی مرتب کی ہے۔ اور وہ دیگر شعبوں میں بھی ایسی پالیسیاں مرتب کررہی ہے۔

سنگت نے اردو کے علاوہ قومی مادری زبانوں میں عالمی ادب اور مارکسسٹ تحریروں کے تراجم شائع کیے ہیں۔ یہ بلوچستان کی قومی و طبقاتی تحریک کو نظریاتی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

سنگت اکیڈمی بلوچستان کی تمام زبانوں کو قومی زبانیں تصور کرتی ہے۔وہ تمام زبانوں کو برابری کا درجہ دیتی ہے۔وہ کسی زبان کی امتیازی حیثیت کے خلاف ہے۔یعنی وہ کسی ایک زبان کی دوسری زبانوں پر حاکمیت و برتری کو ناجائز سمجھتی ہے۔اس لیے اس نے بلوچی رسم الخط اور اظہار و تحریر کی زبان کو فیوڈل خطابات و القابات، تکلفات اور طبقاتی بندھنوں سے آزاد کیا ہے۔اس طرح سنگت نے اپنی دو دہائیوں سے زائد کی مدت تک محیط سرگرمیوں کے ذریعے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد جاری رکھی ہوئی ہے۔

اس لحاظ سے سنگت اکیڈمی آف سائنسز بلوچستان کی واحد ادبی تحریک ہے، جو بلوچستان، پاکستان اور دنیا بھر کی پیٹی بورژوا اور بورژوا تنظیموں، اکیڈمیوں، سوسائٹیوں اور اداروں سے یک سر مختلف ہے، جو سرکار، دربار اور سردار کی بیساکھیاں لے کر چل رہے ہیں۔یہ سب تنظیمیں اور ادارے ریاستی امداد، کمک، گرانٹ اور انعامات و اکرامات کے رہینِ منت ہیں۔یہ سب کے سب سٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے ہر انقلابی تحریک کی راہ میں مزاحم ہیں۔اس لیے یہ سب پیٹی بورژوا اور بورژوا تنظیمیں اور ادارے ریاستی نظریہ کے حاشیہ بردار ہیں۔

یہ پیٹی بورژوا اور بورژوا تنظیمیں اور ادارے فن برائے فن کے نظریے کے قائل ہیں اور اسی عوام دشمن نظریے کا پرچار کرتے رہتے ہیں۔یہ سرکاری کلچر کی نمائش میں ریاست کو خام اور پختہ مال فراہم کرتے ہیں۔یہ سرکار کے لٹریری فیسٹیولز، کانفرنسوں اور ادبی و ثقافتی اجلاس کے منتظم بنتے ہیں۔یہ سرکار کی جانب سے ٹی وی، ریڈیو، پریس کلب اور آفیسرز کلب میں مزین ہر جلسے، مشاعرے اور مذاکرے میں مہمانِ خصوصی یا صدارت کی مسندوں پر براجمان دیکھے جاتے ہیں۔یہ بورژوا ریاست میں اپنے فن وادب کے ذریعے فرد، طبقہ اور اقوام کا رول متعین کرتے ہیں کہ وہ کس طرح کیپٹلزم کی خدمت سرانجام دیں۔

جب کہ ان بورژوا اور پیٹی بورژوا تنظیموں کے مقابلے میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز ڈرائنگ روم دانشوری کے کلچر سے کوسوں دور ہے اور اس کا اصل میدان عوام کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔اس لیے یہ فن برائے فن کے نظریے میں نہیں بل کہ فن برائے انقلاب کے نظریے میں یقین رکھتی ہے۔کیوں کہ ادب کا کام صرف تفریح فراہم کرنا نہیں ہے بل کہ اس کا کام دنیا کو تبدیل بھی کرنا ہے۔سنگت مزدوروں، کسانوں، چرواہوں، ماہی گیروں، ملاحوں، کان کنوں، مظلوم قوموں اور ستم دیدہ عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔علاوہ ازیں وہ ترقی پسند انقلابی دانش وروں، طلبا اور طالبات کی بھی ترجمان ہے۔

سنگت پرولتاریہ اور کسانوں کے جمہوری انقلابی اتحاد میں یقین رکھتی ہے اور اس اتحاد کا رہنما پرولتاریہ کو سمجھتی ہے۔کیوں کہ پرولتاریہ ہی سوشلسٹ انقلاب کا ہراول دستہ ہوتا ہے۔سنگت سٹیٹس کو کے خلاف سوشلسٹ انقلاب میں یقین رکھتی ہے۔کیوں کہ وہ ایک ایسے سماج کے قیام کی خواہاں ہے، جس میں پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے تحت طبقاتی برابری، قوموں کا حقِ خود ارادیت بشمول علیحدگی اور مرد و زن کے درمیان صنفی مساوات کی ضمانت حاصل ہو۔

عالمی کیپٹلزم کے خلاف سنگت کی لڑائی اب تک جاری ہے اور کیپٹلزم کے خاتمے تک جاری رہے گی۔سنگت کی یہ لڑائی دنیا بھر کے ان ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں انقلابی دانش وروں کی لڑائی ہے، جو طبقاتی استحصال، قومی جبر اور صنفی نابرابری کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

ریفرنسز

1۔شاہ محمد مری۔ملک محمد پناہ۔عشاق کے قافلے۔کوئٹہ: سنگت اکیڈمی، 2022ء۔جلد 27۔ص 128
2۔جاوید اختر۔ دیدہ ورانِ بلوچستان۔خیر دین: خیر دین ادبی سنگت، 2023ء۔ص

زندگی

آمنہ ابڑو

سنو زندگی
مجھے تم سے پیار ہے
بہت پیار۔۔
اتنا پیار۔۔کہ
میں تمہارا ہر ایک پل چکھ کر۔۔
تمہیں۔۔
تمہارے جوہر کے ساتھ
جینا چاہتی تھی..
مگر۔۔۔۔
میں نے مصلحت
اور،
کسی اور کی طے کردہ
وفاداری کا طوق
اپنے گلے میں پہن لیا
اپنی مرضی سے۔۔۔
کہ طوق پہننا میری وجودیت کیلئے ناگزیر تھا۔۔
زندگی!
بہت سال بیت گئے۔۔
اور۔۔
میں تمہارا ذائقا تک بھول چکی۔۔
مگر۔۔۔
سنو۔۔۔
سنو زندگی!
میرے وجود کے ٹیسٹ بڈز میں
تمہاری چاشنی گھلی ہوئی ہے۔۔۔
مجھے پھر سے تمہیں جینا ہے۔۔
قطرہ قطرہ ہی سہی۔۔
میں پھر سے جینا چاہتی ہوں۔۔
یہ حساب لگائے بغیر کہ۔۔
باقی کتنا وقت بچا ہے۔۔
مجھے۔۔
جینا ہے۔۔زندگی

سنگت اکیڈمی کی سرگرمیاں

ڈاکٹر منیر رئیسانی

سنگت اکیڈمی آف سائنسز لکھنے، پڑھے، غور کرنے، سوچنے، بولنے اور عمل کرنے والے لوگوں کی ایسی تنظیم ہے کہ جو اس بات کی قائل ہے کہ اس دنیا کو عام انسانوں کے رہنے کے لیے خوبصورت بنایا جائے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ بغیر کسی طبقاتی، صفی، نسلی، لسانی یا علاقائی تقسیم کے ہر انسان کو محنت کرنے اور اس محنت کا پورا پھل حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ ہر انسان کو سیاسی اور سماجی حقوق ملنے چاہییں چاہے وہ کسی طبقے، علاقے یا جنس سے تعلق رکھتا ہو۔ تعلیم، زراعت، کاروبار یا ملازمت پر کسی ایک یا چند گروہوں کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں شروع سے عام جنگوں، مساوات، ناانصافیوں اور خونریزوں سے ایک ہی عنصر نظر آتا ہے کہ سب کچھ میرا یا میرے گروہ کا ہے کیونکہ میں اہم سب سے افضل ہیں، اشرف ہیں۔ اس اشرفیت کے واہمے نے دنیا کی حقیقت کو بگاڑا ہے۔

قدیم سوبوٹمبا کے اولین حکمران جن کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ دراصل زمین کتنی بڑی ہے اور کس شکل کی ہے وہ بھی لکھواتے تھے کہ آسمان نے مجھے زمین کے چاروں کونوں کا حکمران بنایا ہے۔ سکندر، چنگیز، تیمور، نپولین، اور ہٹلر نے اسی واہمے کے پیچھے دنیا کو جہنم بنائے رکھا۔

معلوم انسانی تاریخ بلکہ قبل از تاریخ کے آثار بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اجارہ داری اور غاصب ہونے کے عمل کے باعث ہی کروڑوں زندگیاں ضائع ہوئیں اور اربوں زندگیاں زندگی جیسی نعمت کی نعمتوں سے محروم ہیں۔

زمین کے جس حصے پر ہم رہتے ہیں وہاں پر جہالت، فرسودگی، لایعنیت، ہر طرح کا تعصب اور بے عملی یا کم عملی عروج پر ہے۔ خلقِ خدا کی حیات غاصبیت کے ہاتھوں گروی ہے۔ اس صورتحال کو بدلنے کے لیے سائنسی کوششیں تو گذشتہ دو تین صدیوں سے جاری ہیں لیکن ابھی ایک طویل سفر باقی ہے۔ تبدیلی کی کوشش اس وقت بارآور ہوتی ہے کہ جب منظّم طور پر کی جائے۔ اسی لیے یوسف عزیز مگسی کی فکری و عملی تحریک مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے تنظیمی شکل اختیار کرتی رہی اور 1997 میں سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے نام سے ایک بار پھر کام کرنا شروع کر دیا۔ سنگت اکیڈمی ایک ترقی پسند، نظریاتی تحریک کے طور پر باقاعدہ منظّم انداز میں کام کرتی ہے۔ کام کرنے کے لیے مختلف شعبے قائم ہیں جو کہ طے شدہ قواعد ضوابط کے تحت کام کرتے ہیں۔

سنگت کا تنظیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے۔

1۔ نورکنی سنٹرل کمیٹی
2 سیکریٹری جنرل
3۔ سنگت سیکریٹریٹ
4۔ ڈیلیگیٹ کانگریس
5۔ جنرل باڈی

سنگت اکیڈمی کی مستقل سرگرمیوں میں ماہانہ سنگت پوہ زانت، سنٹرل کمیٹی میٹنگ، جنرل باڈی میٹنگ اور سنگت سیکریٹریٹ کی کارکردگی شامل ہے۔

سنگت سنٹرل کمیٹی

یہ کل نو ممبرز پر مشتمل ہوتی ہے۔ سنٹرل کمیٹی کو سنگت کی ڈیلیگیٹ کانفرنس میں منتخب کیا جاتا ہے۔ ہر تیسرے مہینے سنٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے جس میں اکیڈمی کے مختلف کاموں کا جائزہ، سنگت کانگریس میں کیے گئے فیصلوں کی روشنی میں لیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی نئی صورتحال پیش آئے تو اس کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کمیٹی کے اجلاس کی روداد، حرف بہ حرف نوٹ کی جاتی ہے جو کہ سنگت رسالے اور سنگت کے وٹس ایپ گروپس میں شائع ہوتی ہے۔

سنگت سیکریٹریٹ

سنٹرل کمیٹی اپنے نو ارکان میں سے تین کو سنگت سیکریٹریٹ کے لیے منتخب کرتی ہے یہ تین ارکان سیکریٹری جنرل کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ خصوصاً سنٹرل کمیٹی کی سہ ماہی میٹنگز کے درمیانی عرصے میں در پیش ہونے والی صورتحال کو دیکھتی ہے۔

سیکریٹری جنرل کے ساتھ دیگر تین سیکریٹریز کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

''سیکریٹری مینجمنٹ کے ذمہ سنگت کے فنکشن کا انتظام کرنا جس میں دعوت نامہ، مقالے جمع کرنا، فنکشن کی روداد لکھنا اور بک سٹال لگانا ہے۔

ii۔ سیکریٹری لیبر کا کام مختلف شعبوں کے مزدوروں سے رابطہ رکھنا ہے جیسے ماہی گیر، کانکن، دست کار اور کسان وغیرہ

(iii) سیکریٹری صحت، تعلیم، آؤٹ، کلچر

جنرل باڈی

یہ باڈی سنگت اکیڈمی کے تمام ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ سنٹرل کمیٹی کے فیصلے جنرل باڈی میٹنگ میں پیش کیے جاتے ہیں اور جنرل باڈی ان تمام فیصلوں کی منظوری، ترمیم یا استرداد کا حق رکھتی ہے۔ ایک سال میں جنرل باڈی کی کم از کم دو میٹنگز لازمی ہیں۔

دوسالہ ڈیلیگیٹ کانفرنس

جنرل باڈی کے ہر تین میں سے ایک رکن کو ڈیلیگیٹ کہا جاتا ہے جو کہ دوسالہ کانگریس کے پہلے دن بند کمرے کے اجلاس میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ کانفرنس سنگت اکیڈمی کی پالیسی تشکیل دیتی ہے۔ سیکریٹری جنرل اور ڈپٹی سیکریٹری جنرل کا انتخاب کرتی ہے۔ اکیڈمی کی دو

سالہ رپورٹوں پر غور کرتی ہے جن میں سیاسی، مالیاتی اور تنظیمی پورٹس شامل ہوتی ہیں۔

دوسرے دن کھلا اجلاس ہوتا ہے جس میں اراکین سنگت کے علاوہ دیگر ہم خیال لوگوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ کھلے اجلاس کے پہلے حصے کی کاروائی سبکدوش ہونے والے سیکریٹری جنرل کے ذمہ ہوتی ہے اس دوران نئے جنرل سیکریٹری، ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور سنٹرل کمیٹی کے اراکین سے حلف لیا جاتا ہے۔ مالیاتی، تنظیمی اور سیاسی رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔ کھلے اجلاس کے حصہ دوئم میں، جو کہ نئے سیکریٹری جنرل کی صدارت میں ہوتا ہے۔ ہر بار کانگریس کی ایک تھیم ہوتی ہے لہذا اس پر بات کی جاتی ہے۔ نئے سیکریٹری جنرل کا خطاب ہوتا ہے جس میں وہ نئے اہداف اور پالیسی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کثیر السانی مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ اور موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے۔

سنگت پوہ زانت

یہ سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی علمی اور فکری نشست ہے جو ہر ماہ کے آخری اتوار کو منعقد ہوتی ہے۔ اس میں سنگت کے ممبران کے علاوہ دیگر احباب بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس نشست کی ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ گزشتہ 27 سال سے باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہے۔ اس نشست میں مختلف النوع موضوعات جن میں سائنس، ادب سماجیات، سیاست، تاریخ، فلسفہ، آثار قدیمہ اور دیگر موضوعات پر مضامین پیش کیے جاتے ہیں اور حاضرین ان مضامین کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ افسانے، انشائیے اور شاعری پیش کی جاتی ہے۔

کبھی کسی صاحب علم کو مدعو کر کے اس سے اس کے شعبے کے بارے میں لیکچر سنا جاتا ہے۔

فیکٹری اندرا بہارگاہ

ویپٹسا روف/شان گل

جنک پکھئی شفٹا اندرا پیہشہ
آں بےزاری آگوں دیثو گوئشتئی
موٹرا منٹر منٹر کشہ
''او منڈ،
تہ اے ڈولہ اندرا تلشکشہ نہ وئے!
ترا گوئر کارڈ نے؟
بروگوئر گیٹ سپروائزرا!''
اغر آں ترا موکلا داتہ ٹھیک ایں

پر آں عجبیں ضدی امنڈے اث
او گیٹ سپروائزرا ژہ پول نہ کثئی
بس تلشکشو پیہشہ
او یک روژنائی والی
کھڑکی اے بڑزا کثئی
او شیطانی آگوں
وثی زوان درا کشتئی موٹر عملہ ءَ چکا

گڑہ یک مشینئے شئیر جنغا شروع بیثہ
مڑدکارا کنغئے شنت
پر ہچ کسی دل کارامانا تکی آنہ یث

انجنا اندازہ بیثہ کہ چے مسئلہ ایں
گوئشتئی:
''مس ہے جنکہ نیں ہے رنگا دراسٹاں!''

''تہ آں جنکہ دراسٹئے؟'' یک آہن کارے آملنڈ وڑی پول کشہ
''تہ کوشیشا کس، پیرنڈیں گوا ثو!
اغر تئی فیصلہ ہمشیں
ما ہے جنکہ چکاہڑ تالہ کنوں۔۔۔!''
انجن چپ و خاموش بیثہ۔
او دیرا ژہ
گر میں سیاہیں ڈغارءِ خوشبوتا لان بیثہ اشی پڑ انی چکا

یک وش گٹیں آوازے آتکہ دیرا ژہ
او مضبوطیں گامانی توار دِہ
او ٹھکو
اش کنے جیثہ

او ہمانہاں کہ وختے آجوائیں ڈغار استہ
بھائیں تش،
بےقراریں ماذ نانی ڈولا، انڈی جثہ او ہنٹر کشہ
او دو ہمیاں وثی ٹکیں چم سیر داشہ کشہ نہ حشہ
نیلیں آزمان ئے

بتلغیں کھڑکی آ ژہ نظار ہا کناناں
یکے آ قول داشہ
چو کہ ناغماں
یک جنکئے تریٹشہ گوں یک مستیں سوتے آ
گڑہ یک چوروے تعریفی نغا ہے
تریٹشئی
او لج ءَ شایانِ شان سُر ترشہ۔

او دربان پیہی نرمی آ،
گوئشتئی
کئیں کئے داخل بیتہ حالا دئیت، کئیں؟
آہنی ءَ در کفغی
پر گڑہ دیثئی، حیا آگوں برشکند ثئی،
وثی سغر گھر ژثئی
شیبز ار کثئی
او گڑہ آں دہ چپ بیثہ

ریاست او انقلاب

شاہ محمد مری

2۔انقلابہ خلاصہ بیان بیشہ

ریاستہ باروا کہ مافکر ہ داروں مارکسا 1848-51 ئے انقلابا ژہ وثی نتیجہ آنی خلاصہ اے دلیلہ اندرا کثغ انت کہ ''لوئی بونا پارٹ ئے ہژدمی برومیئر'' نامیں کتابہ اندرا داشیاانت:

''پر، انقلاب تہ سخت وسنگین ایں۔اے دانڑتی کفارہ ئے ہندءَ والی دگ ءَ مسافری آ کنغیں۔اے وثی کارا قاعدہ وضابطہ ڈولہ کنت ۔ 2 دسمبر 1851 (لوئی بونا پارٹ ئے کودتائے روش) آداں اشیا وثی تیاری والائیں کارئے نیم پیلہ کثغ اث۔ ئیں اے دوہمی نیما پیلہ کنغیں ۔سری تہ اشیا پارلیمانی طاقت پیلہ کثہ، تا کہ آنہی تختہ چپی کنغہ لائخابی۔ ئیں کہ آنہیا ہمے کار پیلہ کثہ، اے انقلاب ئے ایگزیکٹوئے پاورا پیلہ کنغیں، داں اے حدا پیلہ کنغیں کہ اشیا آنہی سُچا ترین ایں اظہارا داں کم کنت، اشیا آئسو لیٹ بزاں تنہا کنت، اشیا وثی مقابلہ آ کاری کہ بلاّں نشان چیذ غ ٹہی اوگڑہ تباہ کنوخیں وثی سجہ ایں انقلابی طاقتاں اشی خلافہ مُچ کنت۔ وختیکہ انقلاب وثی ابتدائی پروگرام ئے دوہمی بہرءَ پیلہ کنت تہ گڑہ یورپ وثی سیٹا ژہ دِرِکہ جنت کڑوبی اومستا گہ گوں واہُو ءَ داری: ''بھلو بھلو، کلورے کثئے پیریں مڑد!''۔

'' ہمے ایگزیکٹو پاورا وثی زبردستیں بیوروکریٹک او ملٹری تنظیما گوں، وثی مزں پاندیں او ہنر مندیں ریاستی مشنری آ (نیم ملین ءَ کچا اہلکار، او نیم ملین ئے آرمی)، او اے ہژمینوخیں مفت واریں پیراسائٹی جان، کہ وثار مارءَ ڈولا سجہ ایں فرنچ سماجہ چکا پیچشی اَیں، او آنہی سجہ ایں مساماں (pores) بندکثی ایں، ہمے ایگزیکٹو پاور مطلق العنانیں بادشاہی زمانغا پیدا بثغ اث وختیکہ فیوڈلزم جہل کفغایث، اشیا ہمشی زوال تیز تریثہ''۔فرسٹ فرنچ انقلابا سنٹرلائزیشن ترقی داشہ، ''پر بہ یک وقت'' اشیا حکومتی اقتدار ئے ایجنٹانی تعداد، مزں پاندی او صفات ودھینثغ انت۔ نپولینا اے سرکاری مشینری پیلہ کثہ۔'' لے جی ٹی مستانی'' بادشاہی او'' جولائی منارکی'' دوئیناں پورہات ئے زیات مزنیں بہرو بانگا سوا دوہمی ہچ نہ کثہ۔۔۔''

''۔۔۔آخرکار پارلیمنٹری ریپلک انقلابہ خلافا وثی سٹرگلہ اندرا مجبور بیثہ کہ وثی زوروظلم ئے طریقہ آں پچی پچی آ حکومت ئے طاقتہ وسیلہ او آنہی سنٹرلائزیشنا دِہ مضبوط کنت۔سجہ ایں انقلاباں ہمے مشینری، پروشغہ بجائے انگت زیات بہتر کثہ۔ بالادستی آ پہ باری باری مڑاناں پارٹیاں ہمے حکومتی بلائیں ڈھانچہ سرا قبضہ کنغ وثی سوب ئے کلاں ژہ مزائیں آوار گنڑ اِث''۔(لوئی بونا پارٹ ئے ہژدمی برومیئر۔تاک 9-98، چیارمی ایڈیشن، ہیمبرگ 1907)۔

ہمے لاجوابیں دلیلہ اندرا مارکس ازم ''کمیونسٹ مینی فیسٹو' مقابلہ آ دیمہ پلوا یک زبردستیں گامے زیری۔مینی فیسٹو اندرا ریاستہ معاملہ دانڑتی یک باز تجریدی صورتے آ باز عامیں لفظ و اظہاراں گوں پیش دارغ بثغ اث ۔ ہمے بڑزی داثغیں اقتباسہ لافا، معاملہ یک تکڑائیں ڈولے آ گوں زیرے جیثہ، او نتیجہ حدا زیات، صاف، قطعی، عملی او سما کفوخیں صورتے آ گِندے جیثہ : سجہ ایں پیشی انقلاباں ریاست ئے مشینری پیلہ کثہ، حالانکہ اے لازماً بھور ینغی اث، ٹکر ٹکر کنغی اث۔

ہمے نتیجہ ریاست ئے مارکسسٹ تھیوری اندرا بنیادی نکتہ ایں۔او بالکل ہمے بنیادی نکتہ زوراخیں آفشل سوشل ڈیموکریٹ ایں پارٹیاں پیلوی آ نظرانداز کثہ، او، بلاشک کہ سیکنڈ انٹرنیشنل ئے کلاں ژہ مزائیں نظریہ زانت، کارل کاؤتسکی آ اے مسخ کثہ (چوکہ ما دیمہ گندوں)۔

''کمیونسٹ مینی فیسٹو' تاریخ ئے عامیں خلاصہ اے داث، کہ مار ریاستا طبقاتی حکمرانی ئے یک عضوہ اے ڈولا گندغہ پہ مجبور کنت او مارا اے لازمی نتیجہ آ دَہ پچینی کہ پرولتاریہ سری سیاسی اقتدار ئے دستکوئی کنغا سوا، سیاسی بالادستی گرغا سوا، ریاستا، ''پرولتاریہ حکمران طبقہ ئے ڈولا منظّم بیثی'' اندرا تبدیل کنغا سوا بورژوازی ءَ چپی کثہ نہ خنت؛ او اے کہ اے پرولتاری ریاست وثی سوباسذت رند رفتہ رفتہ ای گار بیغہ شروع کنت اے خاطرا کہ ئیں ریاست غیرضروری ایں او ہمنگیں سماجے اندرا وجودہ داشتہ نہ خنت کہ آنہی اندرا کلاس دژمنی مہ ونت۔او اے ٹوک ایذا کڑو کنغ نہ ویثہ کہ، تاریخی رذوم ئے حسابا پرولتاری ریاست شوں بورژوازی ئے ہندءَ گیڑت۔

ہمے معاملہ مارکسا 1852 آ کڑو کثو جواب داثہ۔وثی جدلیاتی مادیت ئے فلسفہ ءَ چکا سچوئی آ او شتاثی آ مارکسا 1848 آ تاں 1851 ئے انقلاب ئے مزں شانیں سالانی تاریخی تجربہ وثی بنیاد ٹاہینتہ۔ باقی ہندانی ڈولا ایذا دِہ آنہی تھیوری دنیائے یک سرجمیں فلسفیانہ تصور، او تاریخئے زبردستیں علمے آ گوں روژنائیں۔

ریاست ئے معاملہ تہ خصوصی ڈولا پیش کثی ایں : بورژوا ریاست، بورژوازی ئے حاکمی آ پہ ضروری ایں ریاستی مشینری تاریخی ڈولا شوں پیدا بثغنت ؟۔اشی اندرا چے تبدیلی آ تلغنت ، بورژوا انقلابانی نیاما او محکومیں کلاسانی آزادیں گامانی دیما اشیا چے رذوم کثہ؟۔ ہمے ریاستی مشین ئے باروا پرولتاریہ ئے چے ذمہ داری انت؟۔

سنٹرلائزیں ریاستی اقتدار کہ بورژوا سماج ئے خاصیت ایں ابسولیوٹزم (absolutism) ئے زوالہ زمانہ آ پیدا بیثہ ۔ ہمے ریاستی مشینری ئے مزائیں خصوصیت دوادارہ انت: بیوروکریسی او مستقل ایں فوج۔مارکس وا اینگلز او ثی کتابانی اندرا دھک مس دھکی ڈسثہ کہ ہزاریں بندیجاں گوں ہمے ادارہ بورژوازی آ گوں بستی آ اینت۔ ہر مزدورءَ تجربہ ہمے تعلق ءَ بازگرا فک او موثریں ڈولہ ڈسی ۔ وثی تلخ ایں تجربہ آ ژہ مزدور طبقہ ہمے تعلقہ پچھارغہ وستابی ۔ ہمے خاطرا آں ہمے نظریہ آ آسانی ءَ گوں سرپذبی او اکھر مضبوطی ءَ گوں ہیل گیڑت کہ آں ہمے تعلقہ اٹل ای ءَ ڈسی ، ہماں نظریہ آ کہ شانہیا پٹی بورژوا ڈیموکریٹ یا تہ وثی جہالت ولاپرواہی آ ژہ انکارہ کنت ، یا اغدہ زیات لاپرواہی آ ژہ ''عامیں صورت ءَ'' تسلیم کنت ، پر مناسبیں عملی نتیجہ آنی کشغ ءَ شموشنت۔

بیوروکریسی او مستقل ایں فوج بورژوا سماجہ جان ئے ''پیراسائیٹ'' انت، ہمنگیں پیراسائیٹ کہ سماج ئے ٹنگ

ٹنگ کنوخیں اندری دژمنی آں پیدا کشہ، پرہمنگیں پیرا سائیٹے کہ آنہی سجہ ایں باز ضروری ایں مساماں ''گٹو'' داٹ۔ کاؤتسکی والی اپرچونزم کہ نیں آفشل سوشل ڈیموکریسی اندرا زورآور بیشی ایں، اے خیالہ چکا فکرءَ کنت کہ ریاست یک پیرا سائیٹے کہ انارکزم ئے خاص او غیر معمولی خصوصیت ایں۔ اے قدرتی ٹوکے کہ مارکسزم ئے ہمے تروڑ مروڑ ہماں فلسٹیناں پہ باز فائدہ مندیں آنہاں کہ ''ماتی وطن ئے دفاع '' ئے نظریہ استعمال کثو سامراجی جنگ ءَ جائز ٹاہینغ او سینگھارغ و پیش کنغ ئے ، پیشانیش کثغیں شرمناکیں حدا داں، سوشلزم گھٹ آڑتہ۔ پر، بہرحال اے بلاشک کہ تروڑ مروڑیں۔

فیوڈلزم ئے زوالہ وختاں ژہ یورپا کہ بے شماریں بورژوا انقلاب دیثغنت آنہانی اندرا بیوروکریٹک او ملٹری مشینا ترقی کشہ، آں بے نقص، مکمل او مضبوط بیغ شروع بیثہ۔ خاص کس، پیٹی بورژوازی کہ ہمے مشین ءَ ذریعہ آمزائیں بورژوازی پلو الاڑوبی او زیاتر آنہانی ماتحت بی، کہ آں راہکانی بڑزی بہراں، کسائیں دستکاراں، دکانداراں او ہمے ڈولیں دوہمی آں نسبتاً آرام دِہ، پرسکون او عزتمندیں کاراں دینت کہ آنہاں عوامہ ژہ بڑزءَ برنت۔ اندازھا جن ایں کہ 27 فروری 1917 آ ژہ رندی شش ماھہ اندرا روسہ لافاچے بیثہ۔ سرکاری ملازمت کہ پیشا پکوئی آ بلیک ہنڈ رڈا دیغ بیثت، آں نیں کیڈٹ، منشویک، او سوشل انقلابیانی آوارءَ مال بیثغنت۔ ہچ کسا سنجیدہ ایں ریفارم آرغہ بار وانہ سوچثہ۔ ہر کوشش بیثہ کہ آں ماثل دارغ بنت ''دانکو کہ قانون سازیں اسمبلی ئے اجلاس بی''، او اشی کنونشن باقاعدگی آ گوں جنگہ پذاداں ماثل دارغ بی!۔ پر، وزیری، ڈپٹی وزیری، گورنر جنرلی وغیرہ وغیرہ ئے منافع دیوخیں عہدہ یا، نوکری آنی آوارءَ بہر کنغ ئے معاملہ آنی اندرا قانون سازیں اسمبلی آ پہ ہچ انتظار، ہچ ماثلی نیست ات!۔ اتحادانی گیم کہ حکومت ٹاہینغہ اندرا لیو کنغ بیثہ، اصلامس، چھڑو ''آوار'' ءَ مال ئے ہمے بہر او دوار بہر و بانگ ئے یک اظہار اشنت، کہ بڑزا ژہ گردَہ جہلا، دراہیں مُلکہ اندرا، ہر مرکزی او لوکل محکمہ اندرا بیاناں آغا یثہ۔

مھرئے در بتکہ

شامیر

ڈکھ کجلانی
بانگھ، بُلّو آنی
کرشک انیشغانی
اوڑ راھکانی
مونجھ دلبرانی
گُل شیر شغ انت ساڑتی آ
دل ساڑتی آ
دوشی کوٹہ آ برف رتکہ

دوشی کوٹہ آ برف رتکہ
او
یار، شی
پرمس پہ شیرے گوئش۔

دلگوشہ نہ خت زورآور
کہ کوڑی سجہ ای پُس پُس اَیں
ہستی، مستی او چُٹکی آں
سجوئیں جہاں ہالواَیں

درشگ گوں بلبل و وشبوآں
ٹیڑ گوں سوزغی نوغ موراں
مرگاں، گھمر وگھورءَ باں
میگڑ سیر بی پیشیناں
جھروٹاں نیم شفی رومستا
سیر سالی شمئے بہرآ تکہ

کشار کار رواھوا و چوھکاری
پہوال گڑ دناں آ کیڑاں
بگ جت ٹمکغئیں شاہ تاری
جیڈی امسر وٹھکو باں

(کہ) سیریں
مئیں وتئ فکرانی
اے کاریث وشی او وشالی
ڈُھل وشا ذھو مستائی۔

اے کل مئیں دلبرءَ سوغاتاں
مئے سوزیں وا ژہ ئے مھرئے در
بوتکہ مئیں سنگت ئے زاری آں
کہ جھنجے گزراتی
المستیں۔

غزل

فضل احمد خسرو

بہت ان ہونیاں سی ہو رہی ہیں
ہمارے ساتھ غزلیں رو رہی ہیں
کبھی جاگیں گی تو پھر حشر ہو گا
ابھی منہ میں زبانیں سو رہی ہیں
برس جائیں گے حملہ آوروں پر
ابابیلیں جو کنکر ڈھو رہی ہیں
ثمر دیکھے گا کوئی اور آ کر
زمیں میں اشک آنکھیں بو رہی ہیں
مجھے ہے خوف راتیں کاٹنے کا
تمھیں غم ہے کہ شامیں کھو رہی ہیں
تمھاری قربتوں کے قہر میں بھی
دعائیں عشق کی مجھکو رہی ہیں
تقاضا کر رہی ہیں رُخصتی کا
ہمیشہ ساتھ سانسیں جو رہی ہیں
سُنا دے گا کوئی موسم سُہانا
جو باتیں خاک میں خسرو رہی ہیں

خطرات کی زد پر آیا پاکستان

ضامن چنگیزی

حضرت علی کا فرمان ہے کہ ''جس معاشرے میں سچ بولنا مشکل ہوجائے وہ معاشرہ تباہی سے نہیں بچ سکتا۔'' اسی مصدقہ نقطہ نظر کو لیکر اب سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج پاکستان انتہائی سنجیدہ اور پرخطر معاشی بحران کا شکار ہے جس کے باعث ملک سیاسی، نظریاتی اور معاشرتی افراتفری کی آماجگاہ بن چکا ہے اور اس کی شدت میں تیزی سے اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے، جس سے ہماری اجتماعی زوال کی عکاسی ہوتی ہے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ جاری صورتحال اور اس کے منطقی اور بھیانک نتائج کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں سے زائد عرصہ سے پورے ملک اور خصوصاً KPK اور بلوچستان بم دھماکوں، خود کش حملوں اور ٹارگٹ کلنگ سے عوام بدترین خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ ملک پر غیر یقینی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ نام نہاد دہشت گردوں کی خاتمے کے تمام دعوے نقش بر آب ثابت ہوئے ہیں۔ حکومت اور سیکورٹی ادارے قتل و غارت گری کو غیر ملکی ہاتھ کا شاخسانہ قرار دیکر خود کو بری الذمہ کر لیتے ہیں۔ نتیجے میں حکومت اور افواج پاکستان اپنے شہریوں کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ یہ المیہ عالمی سطح پر ملک کو خطرناک نتائج سے دوچار کر سکتی ہے۔ اس نازک حالات کا سب سے خطرناک پہلو ستم دیدہ عوام کی جاری خون ریزی کے لیے الزام خود ریاست اور اس کے عسکری اداروں پر عائد کرنا ہے۔

انسانی معاشرے مختلف نوعیت کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، جن کے حل کے لیے بہترین آپشن عقل و دانش اور تدبر کی حیثیت مسلمہ سمجھی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں پرامن ذرائع کے ذریعے مسائل حل کرنے کی بجائے جنگی وژن اور عالمی استعمار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سازشی تھیوریوں سے مقاصد حاصل کرنے کی روش اختیار کی گئی ہے، جس کی وجہ سے ملک بدترین انتشار سے دوچار ہوا ہے۔ ملک کی زوال پذیری کو دیکھتے ہوئے بہت سے شہریوں کو خدشات لاحق ہیں کہ کیا ہم ملک کی سالمیت اور بقا کو یقینی بنا سکتے ہیں کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان پر بین الاقوامی، معاشی اور سیاسی دباؤ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، جو بجا طور پر باعث تشویش ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ستم ظریفی بھی یہ ہے کہ ہم خود اپنی ناعاقبت اندیشی کے باعث عالمی قوتوں کے لیے جواز فراہم کر رہے ہیں۔ اب جبکہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے، لہٰذا عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ ہم مفروضوں کی بجائے اس ناقابل تردید حقائق کو تسلیم کر لیں کہ معاشی ترقی اور سیاسی استحکام کے لیے ملک میں امن کا قیام ناگزیر ہے۔ ملک کو کثیر الجہتی بحرانوں سے نجات دلانے کا واحد حل بھی یہی ہے کہ ملک کے تمام ادارے آئین و قانون کی پاسداری کی ضرورت کو دل و جان سے تسلیم کریں جس سے ملک میں اجتماعی ڈسپلن کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔ اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب تک ہم اپنی اجتماعی خامیوں، غلطیوں اور فریب کاریوں کا ادراک نہیں کریں گے اُن کے ازالے کا احساس جنم ہی نہیں لے سکتا۔ اجتماعی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں بہتری کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ اب جب کہ ہمارے حقیقی حکمرانوں کے برے اعمال و کردار روز روشن کی طرح عیاں ہو چکے ہیں جس سے ہر شخص بخوبی واقف ہو چکا ہے۔ ہمارا المیہ ہے کہ مسائل حل کرنے کی سوچ اور تدبیر کو دانستہ صرف نظر کر کے اپنے کوتاہ فکری سے ملک کو نئے نئے اور گھمبیر مسائل سے دوچار کرنے میں لگے ہیں۔

اس تمہید کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عالمی استعمار کی تقلید میں مذموم مقاصد کے لیے اپنائی گئی سازشی تھیوریوں کے بے جا استعمال سے ریاست اور عوام کے درمیان جو عدم اعتماد کی خلیج پیدا ہوئی ہے وہ درپیش ملکی صورتحال کا خطرناک ترین پہلو بن چکا ہے۔ اس حقیقت کو قبول کر لیا جائے کہ ملک کے بائیس کروڑ عوام کا اتحاد و یکجہتی ہی ملک کی بقاء وسلامتی کی ٹھوس ضمانت بن سکتی ہے۔ جبکہ ہماری نااہلی اور انتہائی غیر ذمہ داری کے باعث عوام تقسیم در تقسیم کی پالیسی کا شکار ہوئی ہے۔ آئین، قانون، انسانی حقوق اور معروضی حقائق سے چشم پوشی کے نتیجے میں ملک کی معیشت، سیاست، حکومت، نظام انصاف، تعلیم و تدریس، صحت عامہ، صحافت سمیت کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جو مصنوعی پن کا شکار نہ بنایا گیا ہو۔ اب ہم آئین، قانون اور اخلاقیات کو جوتے کی نوک پر رکھنے کے منطقی انجام کی طرف تیزی سے گامزن نظر آتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ بدقسمتی یہ ہے کہ اس ساری ناعاقبت اندیشی کا ادراک بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔ ملک کے حقیقی حکمران ہوش کے ناخن لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بین الاقوامی قوتیں پاکستان کو ایک ناکام ریاست ثابت کرنے کیلئے خود ہمارے پیدا کردہ شواہد ہی کو ہمارے خلاف بطور ٹھوس شہادت استعمال میں لائیں۔ اور ایسی صورت میں جب ملک ایک ایٹمی قوت بھی ہے، اس سے عالمی استعمار کو اور زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ جنگی وژن اور سازشی تھیوریوں کے ساتھ خدانا خواستہ 1971ء کی تاریخ دہرائی جاسکتی ہے مگر ملک کو امن و استحکام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ قومی سوال ایک حقیقت ہے جو قومیتوں کے تمام جائز حقوق تسلیم کر کے انہیں آئینی تحفظ فراہم کیا جانا ناگزیر ہے۔ ملک کو بدترین معاشی بحران میں مبتلا کرنے والے اسباب و عوامل کا خاتمہ ملک کی بقاء وسلامتی کیلئے اہم ہے۔ کیونکہ معاشی آزادی کے بغیر آزادی کا تصور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

کتاب کا قیدی۔۔(صفیہ حیات)

ساجد علی ساجد

کرب تحریر نہیں ہوتے، ان کی تصویر کشی ممکن نہیں، دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لئے جائیں، سانسیں لکڑی نہیں کہ کاٹ دی جائیں۔ آنسو دریا کا پانی تو نہیں کہ ان کے آگے بند باندھ دیا جائے۔ میں حیرانی کی اس منزل پر کھڑا ہوں، جہاں سائے بدن چھوڑ جاتے ہیں۔ مرے سامنے اک کتاب ہے جس کی ہر نظم وجود رکھتی ہے باتیں کرتی ہے، آہیں بھرتی ہے سسکیاں لیتی ہے۔

اک نظم سے نظر چرا کر گزرنا چاہا، تو اس نے مرا دامن اشکوں سے چھید دیا، مسکراتے ہوئے گیلی آنکھوں سے بولی بستر کی شکنوں میں چھپے خواب ڈھونڈتے ہو۔ مجھے دیکھو میں کرب کی اس کگار پر بے خوف کھڑی ہوں جہاں پنچھی بھی بیٹھتے ہوئے کتراتے ہیں. میں عذاب کے اس برزخ سے لوٹی ہوں جہاں خودکشی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔ میں نظم سے دامن چھڑا کر بھاگا تو کتاب میں قید دروازہ پیٹتے بھسم ہوتے ہوئے لوگوں سے جا ٹکرایا، نظم اجاڑ بنجر رتوں کا سارا کرب لئے پھر مرے سامنے کھڑی تھی۔

"ہماری زمین درد کے بیج اگانے کے لئے بہت زرخیز ہے"

مجھے درد کا پتا پتوں میں ملا اور سارا کرب پھولوں کے قرب سے۔۔۔ابھی میں راہِ فرار کی تاک میں تھا کہ وہ بولی۔۔۔:

"ہمارے ہاں اطمینان کے موسم سازگار نہیں
ہمیں کرلانے کی عادت بچپن میں ڈال دی جاتی ہے
نومولود کے کان میں یہ بات بچپن سے ڈالی جاتی ہے
تمہیں مرنے تک صرف رونا ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے اس فنا زادی سے پوچھا۔۔۔
تم کون ہو؟؟؟؟

ان نیم مردہ وجودوں کے درمیان تم کیسے بدن اوڑھ کر کھڑی ہو۔ درندوں کے اس جنگل میں ہوس بھری نگاہوں اور رال ٹپکاتے بوالہوس لوگوں سے تمہیں خوف نہیں آتا۔

کہنے لگی۔۔۔۔۔مرے جسم میں ان گنت صلیبیں گھڑی ہیں، یہ مرد کہلانے والے نامرد گھر کی چار دیواری میں قید حوا زادیوں کے لئے مرد ہیں۔

میں نے اجنبیت کی دیوار سے جھانک کر اسے دیکھا تو مجھ سے کہنے لگی۔۔۔۔۔میں نظم ہوں۔ اور مرا، سب کچھ نظم ہے۔۔۔۔۔

"نظم، میرے خواب ہیں
جو جہیز کے سامان میں سنبھال رکھے ہیں
نظم، ایک دن ہے
جو میں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے گزارا"

صفیہ حیات کی شخصیت کا ادراک وہی کر سکتا ہے، جو خدائی وصف رکھتا ہو۔ کپل وستو کے راج کمار سدھارتھ کو جب نروان ملا تو بولا۔۔۔تمام دکھ ہے۔۔۔۔۔ میں " ہوا سے مکالمہ " کرتی اس کرلاتی کونج سے متعارف ہوا تو میں نے جانا۔۔۔تمام دکھ ہے۔۔۔۔۔ ہم دکھ آنگن میں پلے اس درخت کی شاخیں ہیں جو ساری دھوپ جھیل کر سایہ دار ہوا۔۔۔۔۔ مجھے صفیہ سے بات کر کے اندازہ ہوا کہ کچی عمر کے خواب ٹوٹنے کا درد کیا ہے اور ہتھیلیوں پر لگی حنا کا رنگ زرد کیسے ہوتا ہے۔ اب اس کے اشک نہیں گرتے، وہ ان موتیوں کو سنبھال کر رکھتی ہے اور انہیں نارسائی کے دھاگے میں پرو کر نظم کرتی ہے۔ اگر وہ نظم نہ لکھتی تو یہ آگ اسے اندر سے جلا کر راکھ کر دیتی۔ اس نے دکھوں کی پرورش کی اور ان کے گیان سے نروان پایا۔ جب وہ یادوں کی کھڑکی کھول کر ہوا سے مکالمہ کرتی ہے تو ہوا اس کی خوشبو پروں میں سمیٹ کر اجنبی دیسوں میں برگد تلے سمادھی لگائے گوتموں کو نروان کا گیان دیتی ہے۔ ہوا کب بھید رکھتی ہے!!! ہوا سب بھید رکھتی ہے۔ ہوا کو بھید ہے سارا ہوا سے کچھ نہیں کہنا۔

میں نظم کو بہترین اظہاریہ سمجھتا ہوں۔۔صفیہ نے اپنے پورے وجود کو نظم کیا تب نظم ہوئی اب صوفیہ سراپا نظم ہے۔ وہ ہوا کی سکھی ہے اور اپنی باتیں اس سے سانجھی کرتی ہے۔ اب " نیم پلیٹ سے نام کھرچتی لڑکی " پورے قد سے کھڑی ہے۔ اسے آلام کی دھوپ جلانے سے قاصر ہے کہ کندن اب کٹھالی سے نکل چکا ہے۔ اب حوصلے کی چاندنی اس کے چہرے پر رقصاں ہے۔ ہوا کے ساتھ اس کی سرگوشیاں اب صدا کا روپ دھار چکی ہیں۔ اب وہ ببانگ دہل کہتی ہے:---

"میں ہر بار
ممنوعہ پھل کھاؤں گی
مجھے وہاں نہیں رہنا
جہاں ریشمی اطلس پہنے عورتیں
مرے محبوب کو جنسی دعوت دیں
اور میں
نگینے جڑے تخت پر بیٹھی انتظار کروں"

اب وہ تہیہ کر چکی ہے کہ الزامات کی پوٹلی اٹھائے ہوئے کبڑے لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا ہے۔

مری دعا ہے کہ "صفیہ حیات" کی آنکھوں میں جلتا الاؤ مشعل کا روپ دھار کر ٹھنڈی اور محبت بھری روشنی تقسیم کرے۔ آمین۔

صفیہ حیات کو کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد

دروازہ پیٹتے بھسم ہوتے لوگ

ہماری زمین
درد کے بیج اگانے کے لئے
بہت زرخیز ہے۔
یہ پل بھر میں اگتے اور تناور ہو کر

درد کے پتوں،
کرب کے پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔
ھمارے ہاں طمانیت کیلئے
موسم سازگار نہیں۔
ہمیں کرلانے کی عادت
بچپن سے ڈال دی جاتی ہے۔
یہ کہہ کر کہ مخلوق کی گریہ زاری
ہنسی سے بہتر بھاؤ بکتی ہے۔
نومولود کے کان میں
یہ بات ڈال دی جاتی ہے۔
تمھیں مرنے تک صرف رونا ہے۔
اور وہ چھوٹے قدموں سے
بھاگنے تک
مسکراتے چہروں کو نوچتا
تیزاب جیسا کھارا پانی
انکے چہروں پہ انڈیلتا
مسخ سازی سیکھتا ھے۔
اور
دوسری زمینوں سے آئے لوگ
انکے پیلاہٹ زدہ ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھ کر
واپسی کی راہ لیتے ہیں۔
وہ بھانپ لیتے ہیں
کہ۔۔۔۔
اس خطے میں
پھولوں اور خوشبوؤں کی ایکسپورٹ پہ پابندی ہے۔
یہاں صرف سفید ٹوپیاں
مناجات کے دھاگے اور منکے بنتے ہیں۔
لوگ وحشت زدہ
لاؤڈ سپیکر کے پکارنے پر بھاگتے ہیں۔
انکی روحیں
کسی پاکیزہ جزیرہ کی تلاش میں
سرگرداں پھرتی مرجاتی ہیں۔
آسماں سے اب نہ پتھر گرتے ھیں۔
نہ پرندے آتے ہیں۔
لوگ من کے سراغ چھوڑ کر
مذہب کا دروازہ پیٹتے بھسم ہو رہے ہیں۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفیہ حیات

زندگی کس گناہ کی فرد جرم ہے
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
گھر کی چار دیواری سے
فٹ پاتھ کے کنارے تک
آنکھیں میرے جسم میں سوراخ کرتی رہتی ہیں۔
میں ان گنت خوابوں کے سہارے
چلتی ہوں
جانے کس طرف
کہ پاؤں سوچ کر غبارے جتنے بڑے ہو چکے ہیں۔
امید کے پھول گر جاتے ہیں
شدید خوف کی لہر قہقہہ لگاتی ہے
میں بیٹھ جاتی ہوں
کلائی گھڑی پر نظریں جمائے رکھتی ہوں
وقت رینگتا ہے
آخر
ایک دن تھک کر مر جائے گا
اور میں بھی
بس بوسیدہ نظموں میں ذکر ہوگا
کتنی بہادر لڑکی تھی
بچوں کو آخری دکھ نہ دینے کے لئے زندہ رہی
۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفیہ حیات

چڑیا کا پہلا خواب
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
چڑیا
عمر کے پہلے حصے میں
پہلی اڑان کے دوران
جنگل جانے کی خواہش لئے جا رہی ہے
اس دن
پہاڑوں سے بادل اترے
اور زندگی کے پہلے تجربے میں
چڑیا نے ایک رات
آبائی گھونسلے سے دور
بہت دور۔۔۔۔۔
ایک بوڑھے کوے کے گھونسلے میں گزاری
اس دن کے بعد
جیتی جاگتی چڑیا کی آواز
اجتماعی سوگ میں روح زخمی کرتی ہے
لیکن
بقیہ زندگی
بہت کم اناج کے سہارے بسر کی
مگر
سفر کا خواب نہیں دیکھا
۔۔۔۔۔صفیہ حیات
ساجد علی ساجد

غزل
ندیم ملک

ہے نظر میں جو آستین کا سانپ
در حقیقت وہی ہے بین کا سانپ

آسماں پر دکھائی دیتا ہے
شب گئے مجھ کو اس زمین کا سانپ

ڈس رہا ہے مجھے محبت سے
مجھ سے لپٹا منافقین کا سانپ

اس زمانے کی جاہلیت سے
منتشر ہوگیا مکین کا سانپ

کاٹ کھانے کو آ رہا ہے ندیم
شکل کا کُل میں مہ جبین کا سانپ

ولادیمیر ایلیچ لینن

ولادی میر مایا کوفسکی

مزائیں تخت باقی انت
اوکسائیں بادشاہی دِہ
سیاہ ایں، دانڑتی بورژوا
چوڈوڈوآں زمستان ئے۔
پر
بہاغہ شروعہ کنت:
لاوا
مزورانی
گند۔۔۔۔۔
پارٹی آتش فشانہ اندرا اژہ بہی گزی۔

9 جنوری،
گاپون
''عوام ئے دوست''
بےنقاب بیثہ۔

ما کفوں
توپکانی گرندھاٹہ اندرا۔
دراثریں قصہ
زارئے بادشاہی معافی باروا
کہ
ختم ءَ بی
مکڈن ئے گشت وکوشا پچی آ
اوسُشیمائے
تباہی پچی آ۔

بس!
بچ باور سر نیا تکہ
پہ بےکاریں ٹوکاں۔
پریسنیا
زیری ہتھیاراں،
چوش مانا تک
کہ تخت
بُھری تکائی نیاماثہ
اوفی الفور
بورژوائے ایزی چیئر دِہ۔

لینن ہر ہندا سانڑیں۔
روش پہ روش
آں مڑی
مزدوراں پچی آ
1905 ءَ نیاما،
اوشتاثی آنز دیخا
ہر بیریکیڈ یئے
ہمت آدیاناں
انقلابا
گوں وثی تیلانک دلیغ ئے ہمتا

پرسنزت
آتکہ غداریں دروہ:
سہریں ربن
جلشکغ انت
یک نشتغیں جنکے بوتہ ڈولا۔
بادشاہ زارا
پڑھثہ مینی فیسٹو
وثی بالکونی آثرہ

گڑہ
تقریر،
سوت،
واہ واہ ئے نعرہ اوتعریف ئے
یک ''آزادیں'' وہش وخوشی ئے ہفتہ
اے رند،
شیر دلیغ بیثغت ہے گُل
گوں توپ ئے زمبھاراں:

مزورانی ہون ءَ چکا
تاراجناناں روث
زارئے قصائی ایں ایڈمرل
ڈوباسوف۔

تک آں جن
سفیثیں گارڈئے
دیمانی چکا
کہ چیکائے ہون ڈوبا رغہ باروا
ڈسنت مارا!

آنہاں بایداث کہ دیثیں
کہ شوں سروشاں لبستی آ،
مزدور
کوڑایاں جناناں گشتغت
ہزارانی حسابا۔
ردعمل شتوپتّا بیثہ۔

دانشوریں اناڑی
پذگرثغنت،
گوشہ نشین
اوبیثغنت
کلاں ثہ زیات مسکین
اندرا اُلف کثی آوثار
گوں ٹمکوخیں موم بتی آں
اوخوشبوئے دونھوآں
ھذا اجثغین انت
ھذا ایاپولغایثّاں

حتی کہ کامریڈ پلیخانوفا وث دِہ
بڑزکثہ یک اُوآ رغے
''اے بالشویکانی غلطی یں؛
اے ہمانہانی ایں،
لیغاریں
ہتھیار مہ زڑتین اثنتش
ہماں وختا
اوہونئے اوٹغ آپھیری نہ واڑتناں،
چوکہ نیں ورغئیں،
رِبانی اندرا ''

بلےایذا
گوں وثی بہادری آ
کہ ہچبر گھٹ نہ یاتک
لینن آ

گڈ شہ غدارانی موتک وواویلا:
”جی، ہا، ماربایداث کہ کشیں ۔۔۔
مس روزانہ اے ٹوکہ
دوہرائیناں۔۔۔۔
حدّا زیات بہادری او، مستقل مزاجی آ
گوں۔۔۔
اونا کام نہ ویثاں۔
اغدہ مس گنداں
مخلوکئے نوخیں پچوخیں بغاوتانی ساعتا
پہ ورکنگ کلاسانی
ظاہر کنغا۔
دفاع نہ
بلکہ حملہ
بایدیں بی
اُستمان ئے“
مزائیں نعرہ
ہماں ہژ میتوخیں وہاوءِ سال
گوں وثی ہونی ایں تالاباں
او قتل عام
مزدورانی
ملین ایں باغی
گزی
اور
ظاہرلی
تیاری سکولہ ڈولا
پہ فیوچرئے بغاوتانی طوفاناں۔

***

او، لینن
یک برے پدا
بدل کنت جیلا کالجے لافا،
مار تعلیما دیاناں
آ ؤخیں مژائی خاطرا،
دوہمی آں تعلیم دیانا
وث علم حاصل کناناں،
دوار نز آرغ پارٹی ئے
بے مردم او منتشریں
سال پہ سال
ہژتالانی اشارو دھغایث:
یک چژ نگے
او مخلوق
اغدہ جھنژ کاٹہ جنت۔
پرگڑہ
آ تکہ سالے
کہ آس ملتوی کثی۔۔۔
1914
گوں وثی دڑدئے طوفانی ایں ہورا۔
اے جوشاخیں
وختیکہ کہنیں وستاذیں مرد
وثی شہپراں (بروتاں) مروڑاناں
او، پناسی برشکنداناں
دیخانی بندیخاں بریسنت
بارہا کہنیں مہم آں
بلے ہے ہول سیل،
جہانی صورتا
قیمہ ئے نیلامی۔۔۔۔
ہماں کہ پولٹاوا
یا
پلیونا
اشی ئے کنت موازنہ آ!

امپیریلزم
گوں وثی سجہ ایں
لڑ او رِبّاں
نقلی ایں دتاناں کیندر کثی آ
گُرّاناں او خُرکاناں،
بازوہش انت
ہون ئے گرگڑ خیں سمندرہ لافا،
شتہ لوہڑاناں
مُلکانی ملکاں۔
آنہی چیاریں
کنڈاں
آرام دِہ،
سوشل محبّ الوطن او چاپلوس،
کڑو کناناں آزمانانی پلوا
آں دستاں
کہ غداری ءَ کن انت،
بندرانی ڈولہ باں رَنت
داں وختیکہ ہر کس ژہ ہمشی آ بیزار بی
”مزدوراں۔۔۔۔
گاماں جنیں دیما
پہ مژائی آ!“

آسنیں سکریپ ءِ ڈھیر
بژز بیاناں،
مکس بیثی آ گوں مردم ئے گوژ دئے
قیمہ
او ٹکر ٹکر پیثغیں ہڈاں۔
ہے سجہ ایں گنوخیں پناہ گاہا
نیاما
زمرواللہ
گوں گراں تواری آ
ایکا جکثی آ یث۔

گیر کئیث
لینن ئے ہماں تقریر
دنیائے بژزاباز زورا
کثئی
بلند بیاناں
یک آوازے
باز بژز
ژہ گولہ باری آ
فلر زیات شوشوخ
ژہ آ سا۔

یک پلوے
ملینانی حساباثنت مزدور
جنگہ محنتہ لافا
دڑ دااثنت لیٹ پیٹ بیثی آ
پہ آرغاسوب ءِ،
دوہمی پلوا۔۔۔
خلافا توپ وزہم ئے۔۔۔
یک مژدے
عامیں قدو بُھت ئے:
”سپاہیاں!
بورژوازی
دروھہ دینت او ر شمار شوشکنت
دیم دینت شوار قصاب خانہ آ
چوکہ پیشا ہزار دھکا کثیش۔
بس، باز بیثہ
اش کنیں منی ٹوکا:
بدل کنیں ہے جنگا
قومانی نیام ئے
ہے جنگا
مس خانہ جنگی آ۔

ایک ازلی سفر ایک ابدی کتھا

قندیل بدر

کیا لکھوں
ایک ادھ بدھ کہانی کا حصہ بنے
کتنی صدیاں ہوئیں
اس کہانی کی گتھی سلجھتی نہیں
ابتدا انتہا کے ورق گم شدہ
درمیاں بھی خلا
کیا ہیں آدم حوا
پانیوں پہ کہیں ٹھہرتے ہیں نشاں
آتے جاتے سبھی نقشِ پا
ہو گئے ہیں فنا
پر تعلق کو کیوں موت آتی نہیں
اس فضا کو سنو
کس قدر شور ہے
کتنی آہوں کراہوں کا چیخوں کا شور
ان گناہوں کا شور جو مکمل ہوئے بھی نہیں
بے گناہی میں ماری گئیں سرخ لاشوں کا شور
شور تھمتا نہیں
یہ فضا سرخ ہے
کن گلابوں میں اترے گا ان کا لہو
ماتمی دن ہے یہ
آؤ ماتم کریں
ان سبھی کا جو بچھڑے تو پھر مل سکے نہ کبھی
ہم بھی کیا
اک تعلق کی مورت کی پوجا میں گم
ہیں ہمارے تعلق کی پرتیں ہزار
ایک سو رنگ ہیں
ان گنت ذائقے
اس کی سیما نہیں ہے کوئی
عمر کی حد نہیں
شکل و صورت سے کوئی علاقہ نہیں
نام سے اور نسب سے یہ آزاد ہے
ہم میں حائل ہیں کتنے زمانی قدم
اور زمینی مقام
ہم کو پرواہ نہیں
ہم میں حائل سماج
کتنے رسم و رواج
ہم کو کب ہے غرض
ہم لکھیں گے یہ ادھ بدھ کہانی
، یہ فکشن ورق در ورق
گر محبت نہیں ہے تو پھر
ان وسیع آسمانوں سے نسبت کیسے
ان زمانوں مکانوں پہ حیرت کیسے
پھر خدا کی بھی ہوگی ضرورت کیسے

کتابوں کے عالمی دن پر مبارک باد

نیلم احمد بشیر

میں نے جب انہیں گھر سے نکالا تو وہ اداس دکھتی تھیں
بے گھری کے خوف سے سہمی ہوئی مہر بہ لب
میری رفیق میری ہمدم میری دوست
ایک ایک کی رخصتی سے میں نے انہیں دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا
کئی ایک کو تو میں نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا
حالانکہ یہ بات خلاف ادب محبت ہے
ان کے اجلے بھیتر سے اپنا من اور ذہن روشن نہ کر سکی تھی
ایک ایک کو بھیجتے سمے میری کوکھ سے درد اٹھا
ہاتھ پیر انگلیاں جیسے کٹ کے گرنے لگیں
دل پر غیریت کے سیاہ بادل چھا گئے
آخر جدائی وصال کا مقدر کیوں ہے
اب نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گی
کس طاق پر آراستہ کس کے لمس کی منتظر
کون سی نئی محبت چھو پائے گی انہیں
کچھ تو میری اپنی تھیں کچھ میرے پرکھوں کی چھوڑی ہوئی
آج میں انہیں انے والے وقت کی زندہ بہتی ندیا کے حوالے کر کے مطمئن ہوں
کم از کم میرے بعد وہ لاوارث نہ ہوں گی
فٹ پاتھ پر سجی
ردی مارکیٹ میں زمین پر گری پڑی
گاہکوں کے انتظار میں تن کھولے کھلے آسمان تلے کسی کی راہ تو نہ تکتی ہوں گی
گاہک بھاؤ تاؤ کرنے میں انہیں بار بار اٹھاتے اور زمین پر پٹخ نہ سکیں گے
لائبریری والے سنو
میرے کلیجے کے ٹکڑے لیے تو جا رہے ہو انہیں پیار سے رکھنا
یاد رکھنا
وقت کی دوڑ اور دیمک کی بھوک بہت تیز ہوتی ہے

غزل

عیسی بلوچ

آسماں پر بجھے تاروں کے جم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں
دل کی ٹہنیوں پر لگے غم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

لائے تو گئے ہیں اتنی بڑی دنیا میں پھر بھی یہ سوچتا ہوں
اتنی بڑی دنیا میں ہم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

من کے کعبہ میں پڑے نیم جاں چاہتوں کے جسموں سے یہ
رستے ہوئے ان دیکھے زخم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

کون ہمیں بتلائے گا ہم خاکساروں کو ورثے میں ملے
یہ درد کس کے ہیں یہ ستم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

پوچھتی ہے خدا سے صدیوں سے لہولہان - بد بخت - بشر
دستور - دین اور دھرم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

مفلسی جان پہ بن آئے تو انسان کب یہ سوچتا ہے
بت خانے میں سجے صنم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

دن کی گردن پر پڑے ہاتھ بتایئے عیسی کس کے ہیں
شب کی جانب بڑھتے قدم کس کے ہیں دیے غم کس کے ہیں

چلو ہم آج چلتے ہیں

طاہرہ احساس جتک

چلو ہم آج چلتے ہیں
کسی ایسے جہاں میں اب
جہاں پر قدر دانی کے
سمندر جوش رکھتے ھوں
جہاں جذبات واحساس کے
چشمے ابلتے ہوں
جہاں دریا محبت کے سریلی
گیت گاتے ھوں
جہاں من کے سما پر
چاہ کے بادل برستے ھوں
چلو ہم آج چلتے ھیں
بھٹکتے ھم رہے اکثر
وفا کی راہ میں احساس
ملا نہ کوئی ایسا چھاوں
کہ سستا ذرا لیتے
چلو ہم آج چلتے ھیں
جہاں نہ بے وفائی ہو
نہ کوئی سرد مہری ہو
جہاں تنہائی کا عالم
نہ کوئی آہ سسکی ہو
جہاں پر پرسکون ھنستے ہوئے
لوگوں کی بستی ہو
چلو ہم آج چلتے ھیں
جہاں نہ خواب ٹوٹیں
نہ دلو کو چوٹ لگ جائے
جہاں ھوا بر وعزت
امان جانوں کو مل جائے
جہاں نہ اپنے ساتھی کو
کوئی پا کر کہیں کھوئے
نہ حسرت اور ارمانوں کی
میت پہ کوئی روئے
چلو ہم آج چلتے ھیں

غزل

سندھو پیرزادہ

آؤ زمانہ چھوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح
ساری یادیں جوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح

کچھ پرانی دوستیاں اور پرانی دل لگی،
آج سب کو موڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح.

تم اگر ہو سامنے بچہ میرا من بنے،
دل میں خوشی نچوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح.

گہما گہمی زندگی کی اور سارے کام بھی،
آجاؤ سب کچھ چھوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح .

پیار کی اک پینگھ ہو اور ہوائیں جھولنا،
بادلوں کو پھوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح.

اک پرانا گاؤں ہو، کھیت اور کھلیان ہوں،
پگڈنڈی پر دوڑ کر کھیلیں بچوں کی طرح .

مزدور کی بیٹی

شہینہ رفعت

مزدُوروں میں مقبُول ہونے کا صِرف ایک ہی راز ہوسکتا ہے، کہ آدمی حقیقت میں مُخلِص ہو۔ ورنہ خالی پیٹ والے لوگ کِسی کی تعریف کرنے میں رواداری سے کام لینے کے قائل نہیں ہوتے۔ یہاں مَیں نے جِتنے لوگوں سے بات کی، سب نے اُس کے قصیدے ہی بیان کیے۔ حالانکہ اس طبقے کے بیانات کے بارے میں مَیں کُچھ مشکُوک ہی رہا ہُوں کہ بھُوک بیان بدلوانے پر بھی بہُت قادر ہوتی ہے۔

کبھی کبھار چودھری صاحب سے بھی مُلاقات ہوجاتی تھی۔ خلافِ توقّع مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر مہربان سی مُسکراہٹ بِکھر جاتی جو مجھے کبھی بھی اُن کی شخصیّت سے میل کھاتی نہ لگتی تھی۔ بہرحال اُن کے تمام ماتحت اُن سے مُطمئن تھے، اِس لیے خواہ مخواہ مسائل پیدا کرتے پھرنا میری عادت نہیں تھی۔ مَیں یُوں ہی مزدُوروں سے گپ شپ لگایا کرتا اور واپس ہولیتا۔ سیاہ کُولتار کی سڑک پر چلتے ہوئے، جو فیکٹری کی عمارت سے باہر گیٹ تک جاتی تھی، مَیں ہمیشہ چودھری صاحب کی قِسمت پر رشک کرتا ہُوا جاتا۔ اُن کی سیاہ چمکدار گاڑی، اُن کی پُروقار اور رُعب دار شخصیّت کے ساتھ بہُت جچتی تھی۔ اُونچا، لمبا قد، بھرا بھرا جسم، خُوب صُورت سیاہ بال جِن میں اب سفیدی جھلکنے لگی تھی اور وُہ اُن کی مہربان سی مُسکراہٹ !!۔ انسان چند لمحے کے لیے متاثر ضرور ہوتا۔ یُوں تو متاثر کرنے کی ایک ہزار ایک وجُوہات تھیں اُن کے پاس !!۔ بے حِساب دولت، چمچماتی گاڑیاں، بڑی بڑی فیکٹریاں اور اُس پر اُن کی سجی سنوری شخصیّت اور دھیما لہجہ !! ۔ پہلے مَیں بھی سمجھتا تھا کہ مزدُوروں کو تو ہر پتّھر کے صنم کو دیوتا بنانے کی عادت ہوتی ہے مگر اب یہ گاہے بگاہے کی مُلاقاتیں گو تعصُّب کی اُس دیوار کو تو توڑ تو نہیں پائی تھیں جو ایک سچّے صحافی کو ایک اپر کلاس کے شخص سے ہوتا ہے مگر اُس میں دراڑیں ضرور پڑنے لگی تھیں۔

آج بھی حسبِ عادت مَیں نے بظاہر مزدُوروں سے گپ شپ لگائی۔ مگر دِل ہی دِل میں کِسی ایڈونچر کی تلاش میں فیکٹری آیا ہُوا تھا۔ یہاں چند مزدُوروں سے میری باقاعدہ دوستی ہوگئی تھی جو مجھے اندر تک کی کہانیاں بھی سُنا دیتے تھے۔ اِس لیے جب اُن کی زبانی بھی مجھے کِسی خطرے کی گھنٹی بجتی ہوئی سنائی نہ دی تو مَیں نے بھی مسیحا بننے کی کوششیں کم کر کے محض اُن کا دکھ درد سننے تک ہی اِکتفا کرلیا۔ لیکن احمد سے باتیں کرتے کرتے میری زُبان کو یکدم بریک سی لگ گئی، جب مَیں نے ہجُومِ دُشمناں میں ایک تن تنہا کمزور اور پُر اَسرار سے وُجُود کو دیکھا۔ مَیں اُسے لڑکی یا عورت نہیں کہہ سکتا تھا کیوں کہ وُہ بہر حال اپنے وُجُود سے بھی بڑی چادر میں لپٹی ہُوئی تھی۔ خزانے کہیں بھی چھپے ہوں اپنے ہونے کے کُچھ نہ کُچھ آثار ضرور چھوڑ جاتے ہَیں! اِس لیے کامل طور پر چادر میں چھپی ہونے کے باوُجُود اُس کا وُجُود درخت میں دُبکی ہُوئی کِسی سہمی فاختہ کی یاد دلاتا تھا جسے پیٹ کی خاطر ہر صُورت نیچے اُترنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے وُہ جانتی بھی ہو کہ نیچے دامِ فریب بچھا ہے۔ وُہ اُفق پر ٹُوٹے تارے کی طرح صِرف ایک لمحہ کو نُمودار ہُوئی اور غائب ہو گئی۔ مگر اپنے پیچھے روشنی کی ایک لمبی لکیر چھوڑ گئی تھی۔ ہاں، مَیں نے شاید چادر میں سے نِکلا ہُوا اُس کا ہاتھ ہی دیکھا تھا۔ مگر میری نِگاہوں میں اب تک روشنی جھلملا رہی تھی۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے احمد کو دیکھا؟

''رحیم بابا کی بیٹی ہے۔ فیکٹری کے ساتھ ہی گھر ہے۔ روز دوپہر کو بابا کی روٹی لے کر آتی ہے''۔

مَیں نے رحیم بابا کی طرف دیکھا۔ برف کی طرح سفید بال، خمیدہ کمر، جُھریوں سے بھرا چہرہ اور ہاتھوں کی پُشت پر نیلی رگوں کا جال۔ اُس شخص کا نو بجے سے پانچ بجے تک فیکٹری میں کام کرنا! میری آنکھوں کے سامنے بہُت بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا۔ مگر ایسے کئی ہزار سوالیہ نشان اِس مُلک کے ہر شہر میں ہر چوراہے پر بِکھرے نظر آتے تھے۔

''لیکن بابا صبح روٹی لے کر کیوں نہیں آتا''؟ مُجھے روشنی کا فیکٹری آنا سخت بُرا لگ رہا تھا۔ اُس کی چمک دمک دیکھ کر مَیں نے خُود ہی اُس کو روشنی کہنا شُروع کر دیا تھا۔ یار، ایک تو تُم سوال بہُت کرتے ہو۔ دیکھ نہیں سکتے کہ وُہ کتنا بُوڑھا ہے۔ صبح کی پکی ہُوئی روٹی کھا سکتا ہے؟'' اور دوسرا بابا کا کہنا ہے کہ لڑکی بہُت ضِدی ہے، اُسے صبح روٹی لانے بھی نہیں دیتی کہ اُسی وقت پکا کر لائے گی تاکہ ساتھ کوئی سبزی بھی لا سکے'' یہ لڑکی پانچ سال کی تھی جب اِس کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ اِس سے چھوٹی بہن اور ایک بھائی ہے۔ خُود مُشکل سے سولہ سال کی ہوگی۔ بابا نے ماں بن کر پالا ہے اِسے۔ یار عامر! یہ بابا اِتنا بُوڑھا نہیں ہے۔ یہ تو غم اور حالات نے اِسے عمر رسیدہ کردیا ہے۔ مجھے اِس سے زیادہ معلُوم نہیں، یہ بھی بابا نے خُود ہی بتایا تھا، ورنہ اُس کی بیٹی کے بارے میں کبھی کِسی نے کوئی سوال نہیں کِیا۔ تم چودھری صاحب کو جانتے ہونا! اِس مُعاملے میں بڑے سخت ہَیں۔ اُن کی وجہ سے کبھی کِسی نے اِس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ شاید اِس لیے بھی وُہ بے خطر ہر روز چلی آتی ہے۔ سب بابا کی اور اُس کی بڑی عزّت کرتے ہَیں۔ مگر جانتے ہو آج تک کِسی نے اِس کی شکل نہیں دیکھی''۔

مَیں نے دوبار بڑے غور سے بابا کا جائزہ لیا۔ اُس کے ماتھے سے پسینے کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ جِسم محنت سے چُور چُور نظر آتا تھا مگر آنکھوں میں کُچھ کر گذرنے کی لگن تھی۔ مجھے اُس لمحہ وُہ بڑا ہی عظیم لگا۔ اُس کی آنکھیں بڑی مُعتبر لگیں جِن میں یقیناً اُس لڑکی کے لیے بہُت اُونچے اور حسین خواب ہوں گے۔ مَیں نے دِل ہی دِل میں اُسے ڈھیر دعائیں دیں اور چلا آیا۔ میرا آنا جانا یُوں ہی لگا رہا اور ایسے میں سہمی ہُوئی فاختہ اور روشنی کی لکیر اُبھرتی اور ڈُوبتی رہی یہاں تک کہ ایک صبح جب میں فیکٹری گیا تو ایک دِل ہلا دینے والی خبر میری مُنتظر تھی۔ ''بابا کی بیٹی مر

گئی ہے‘ میرا دِل چاہا احمد کا مُنہ نوچ لُوں۔ فاختہ اُڑے گی نہیں تو اُس کے سفید پر آسمان کی نیلاہٹوں کو کیسے اُجاگر کریں گے؟ اُفق پر ستارہ نہیں جھلملائے گا تو روشنی کی لکیریں لوگوں کی رہنمائی کیسے کریں گی؟.....

گُلابوں کو کُچھ دیر تو مہکنا چاہیے۔ ہوائیں جُھوم کر نہ چلیں تو حبس کیسے کم ہوگا؟ خُوشبُو کیسے پھیلے گی؟ سبز پتّوں والے درخت سُوکھ گئے تو بھٹکے ہوئے مُسافر کہاں ٹھہریں گے؟ نہیں یُوں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا، مَیں سر جھٹک جھٹک کر کہہ رہا تھا مگر آسمان کی سُرخی اور گرد آلُود ہوائیں مُجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ایسا ہُوا ہے ایسا ہوگیا ہے۔ میرا دِل موم بن کر بہہ جانا چاہتا تھا ’’مگر ایسا ہُوا کیسے؟ ‘‘ مَیں نے احمد سے پُوچھا۔ ’’بابا کہتا ہے کہ رات وُہ حسبِ معمول سوئی تھی مگر صبح جب وُہ اُسے جگانے گیا تو وُہ جا چکی تھی!!‘‘، ’’اِتنی آسانی سے؟؟‘‘ میرے حلق میں کُچھ اٹک کر رہ گیا۔ من من بھر قدم اُٹھائے واپس آیا۔ فضا اِتنی تاریک تھی کہ مجھے کُچھ دِکھائی نہیں دے رہا تھا یا پھر میری آنکھیں ابھی تک اُس کی روشنی سے چُندھیائی ہُوئی تھیں۔ ہاں میرے لیے وُہ لڑکی روشنی کا مینارہ ہی تھی، جِس نے بُوڑھے باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اپنے ریشم جیسے وُجُود کو قربان گاہ پر رکھ دیا تھا۔ ابھی تو مَیں اس کے عزم و ہمت کی داستاں بابا سے سننے کی ہمت جمع کر رہا تھا۔ کہ کونج ڈار سے بچھڑ گئی تھی۔ سر ہاتھوں میں دیے مَیں کافی دیر سے بابا کے متعلّق سوچ رہا تھا جِس کی ساری مزدُوری ایک لمحے میں چھن گئی تھی۔ جِس کی آنکھوں سے خواب پَل بھر میں کانچ کے برتن کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئے تھے۔ وُہ سوچتا ہوگا کہ جانے کے دِن تو میرے تھے روشنی کے تو یہ سُرخ جوڑا پہننے کے دِن تھے پھر اُس نے سفید لِباس کیوں مُنتخب کر لیا۔ مَیں نے سوچا، مَیں ضرور اُس کو تسلّی دینے جاؤں گا۔ اور اِس اچانک موت کی وجہ بھی جان کر رہُوں گا۔

اِس بات کو تین دِن گُذر چکے تھے۔ بُجھے دِل سے مَیں احمد کو ساتھ لیے بابا کے گھر چلا گیا۔ گھر کے باہر کی فضا سخت ویران دُھندلائی ہُوئی اور تنی تنی سی تھی۔ ہوائیں بین کر رہی تھیں اور بادل ماتم کناں تھے۔ بابا کی کمر کُچھ اور جُھک گئی تھی۔ چہرے کی جُھریوں میں بے پناہ اضافہ لگ رہا تھا اور ہاتھوں کی پُشت پر نیلی رگوں کا جال کُچھ اور پھیل گیا تھا۔ اُس نے اِتنی زخمی نظروں سے مجھے دیکھا کہ مجھے اپنی رُوح تک چھلنی ہوتی ہُوئی محسُوس ہُوئی۔ مَیں نے بابا کے کندھوں پر ہاتھ رکھے مگر کوشش کے باوُجُود ایک لفظ بھی میرے مُنہ سے نِکل نہ سکا۔ بڑی گھٹن اور خاموشی کے بعد بمشکل وُہ ہی گویا ہُوا ’’وُہ ایک فرشتہ تھی، بیٹے۔ نیکی، نُور اور مہربانیوں کا فرشتہ۔ اُس نے میرے آنگن کو روشنی اور خُوشبُو سے بھر دِیا تھا مگر بیٹا فرشتے کبھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے، وُہ خُوشیوں اور امن کا پیغام دیتے ہَیں، روشنی اور خُوشبُو پھیلاتے ہَیں اور چلے جاتے ہَیں‘‘۔ اُس کے بعد وُہ کُچھ دیر تک چودھری حشمت کی بڑائی اور عظمت کے گُن گاتا رہا ’’ہماری اِنتہائی غُربت کے باوُجُود صاحب نے میری بیٹی کے شایانِ شان اُس کا جنازہ کروایا تھا۔ بیٹا مَیں تو اُس کی رُخصتی پر بھی اِتنا خرچ نہیں کر سکتا تھا جِتنا اُنھوں نے اُس کی موت پر کر دیا!‘‘۔ بابا کو اَن کہی کہانیاں سُناتا چھوڑ کر مَیں اپنے دفتر چلا آیا۔ کیوں کہ مُجھے سُنی ہُوئی کہانیوں اور روشنی کی زندگی میں کوئی مُطابقت نظر نہ آتی تھی۔ دفتر میں میری میز پر انجانی تحریر والا ایک لفافہ پڑا تھا۔ مَیں نے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

’’عامر صاحب! مَیں آپ کے لیے اجنبی ہُوں مگر آپ میرے لیے اجنبی نہیں کیوں کہ اخبار میں اکثر آپ کے کالم پڑھتی ہُوں۔ مَیں نے دسویں جماعت تک پڑھا ہے۔ اگر یہ لِکھنے بیٹھوں کہ کیسے پڑھا ہے تو رات بیت جائے گی اور میرا سفر ادھورا رہ جائے گا۔ مَیں اِس صبح کا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتی جِس کے اُجالے میں ہم جیسی اُجلی لڑکیوں کے مُنہ کالے ہو جاتے ہَیں۔ اِس لیے مَیں جِتنا لِکھوں گی اِس کو ہی بہُت بہت سمجھ لینا۔ ویسے بھی میری تحریر شاید میری ہی طرح کمزور ہوگی مگر میری کہانی کمزور نہیں، یہ اتنی جاندار ہے کہ بڑے بڑے سورماؤں کے دِل ہِلا دے گی۔ اور رشتوں کی شہ رگ کو کاٹ کے رکھ دے گی۔ میرے لیے محبتوں اور شفقتوں کا ایک ہی نام تھا اور ایک ہی چہرہ..... بابا!!!..... چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے تو یہ چہرہ مَیں ہی تھی (جب یہ چہرہ ہی نہیں رہا تو مَیں کیوں رہُوں؟) ہمیں زندہ رکھنے کے لیے بابا کو اپنا خُونِ جگر جلانا پڑا جبھی تو اُنھوں نے میلوں کی مسافتیں لمحوں میں طے کر لی ہَیں ورنہ میرے بابا کی عُمر اتنی نہیں ہے۔ میرا ایمان تو صِرف بابا ہے، کیوں کہ میری آنکھوں نے صِرف اُسے اور اُس کی سچائیوں کو ہی دیکھا ہے اور جُھوٹ ہے۔ میری ضرُورتیں اُس نے ہی مرمر کے پُوری کی ہَیں اِس لیے مَیں اُسے ہی دیوتا مانتی ہُوں۔ میرے چھوٹے بہن بھائی ابھی تک جنگل میں کھِلنے والے پھُولوں کی طرح ہَیں جنھیں لہلہاتے اور بڑھتے جانے کے سِوا اور کوئی کام نہیں۔

مگر میرے دِل میں اُن کی فِکر کے ساتھ ساتھ بابا کی محنتوں کا غم بھی ہر روز جوان ہوتا جاتا تھا۔ سو مَیں نے جی جان سے اُن کی خِدمت کو اپنا ایمان بنا لیا۔ بابا چودھری حشمت علی کے گُن گاتے نہیں تھکتا تھا اُنھیں فرشتہ سمجھتا تھا۔ چُوں کہ بابا خُود خُدائی صِفات رکھتا ہے، اِس لیے دُوسروں کو فرشتہ سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔ اُنہی کی زُبانی یہ قصیدے سُنتے سُنتے مَیں بھی اُنھیں ’’فرشتہ‘‘ سمجھنے لگی۔ اِسی لیے جب اُس صبح بابا نے خلافِ توقّع فیکٹری سے جلدی واپس آ کر مجھے بتایا کہ فرشتے کی بیوی سخت بیمار تھی اور اتفاق سے آج اُن کے نوکروں کی فوج بھی چھٹی پر ہے (عامر صاحب نوکروں کی فوج کو چھٹی کروائی گئی تھی) اِس لیے اگر بابا بُرا نہ منائیں تو مجھے اُن کی بیوی کے پاس شام تک بھیج دیں۔ بھلا دیوتاؤں کو بھی کوئی ناراض کرتا ہے؟ بابا کا سفید سر اُن کے اِحسانوں کے بوجھ تلے دبا ہُوا تھا۔ اُنھوں نے اِس خدمت کو عین عبادت سمجھ کر مجھے اُن کے ساتھ بھیج دیا۔ یہ فرشتہ نُما آدمی مجھے اور بابا کو گاڑی میں بٹھا کر اپنے وسیع و عریض بنگلے پر لے گیا، مجھے گھر کے اندر داخل کر کے اُس نے بابا کو وَہیں سامنے بٹھا کر مُجھے کچن دِکھایا، کام بتایا اور پھر وُہ بابا کے ساتھ ہی فیکٹری لوٹ گیا۔

مَیں جب کمرے میں داخل ہُوئی تو وہاں پُورے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مَیں نے دروازے کو دیکھا، وُہ بند تھا اور عامر صاحب! مجھے اُن کے بُلند و بالا دروازے کھولنے کی ترکیب نہیں آتی تھی کیوں کہ ہمارے گھر میں تو صِرف کمزور سی کُنڈیاں ہی لگاتے تھے۔ مَیں جلدی جلدی کام ختم کرنے کے چکّر میں برتن دھونے لگی۔ کوئی

پینتالیس منٹ کے بعد یہ شخص واپس آ گیا، مجھے کچن سے باہر بُلایا اور ایک خُوب صُورت پیکٹ دیا، اِس میں نیا لِباس ہے وُہ پہن لو۔ تم اِن کاموں کے لیے نہیں بنی ہو۔ اُس نے برتنوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بابا کی طرح مَیں نے بھی مِیلوں کی مسافتیں لمحوں میں طے کر ڈالیں۔ اگر اُس وقت آپ مجھے دیکھتے تو میرا سر بھی آپ کو سفید نظر آتا اور کمر خمیدہ، مُجھے ہر طرف فاختائیں اور باز اُڑتے ہوئے نظر آنے لگے!!! مَیں نے اُونچی اُونچی دیواروں کو دیکھا اور بند کھڑکیوں سے دُور پرے آسمان سے باتیں کرتی دیواروں کو!! چیلیں اُڑتی ہُوئی آسمان کی وسعتوں میں گُم ہو رہی تھیں۔ مَیں جنموں تک بھی روتی رہتی تو کوئی میری آواز نہ سُنتا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مَیں اُس کی پانچ سالوں کی ریاضت ہُوں۔ اُس نے ہر دِن مجھے کھانا لاتے اور واپس جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے میرے ہاتھوں اور پیروں کو دیکھ کر ہی میری ساری ہڈیاں گن لی تھیں۔ عامر صاحب! میری محبت نے بابا کو مار ڈالا۔ کاش مَیں اُن کی بات مان لیتی اور اُنھیں صبح ہی کھانا لے جانے دیا کرتی۔ مگر مُجھ پر تو بابا کی محبت کا بُھوت سوار تھا۔ عِشق کِسی بھی رنگ میں ہو مار ڈالتا ہے!۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی ایک بیٹی میرے برابر ہے مگر مَیں اُس کی مجبوری تھی وُہ کیا کرتا وہ دِل کے ہاتھوں بہُت مجبور تھا۔ بیچارہ یہ بڑے لوگ اور اُن کی مجبوریاں؟؟ میرے سپنے میرا وُجُود، میرا رنگ، میرا رُوپ اُسے کِسی لمحے جینے نہیں دیتا، وُہ تصوُّر میں ہر پَل میرے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کی بیوی خُوب صُورت مگر بدمزاج ہے (لڑکیوں کو پھنسانے کے لیے مردوں کا مخصوص بہانہ) اُسے کبھی دُوسری شادی کی اجازت نہیں دے گی، اِس لیے مجبوراً مجھے اُسے یُوں ہی مِلنا پڑا کرے گا مگر اُس کے عِوض وُہ مُجھے سونے میں تول دے گا۔ اور میرے گھر والوں کو زمین سے آسمان پر بٹھا دے گا۔ اور میرے تو سب خواب پُورے کرے گا خوابوں کا مطلب نہیں جانتا تھا وہ پھر اُس کمرے نے، اُس بنگلے نے اور اُس کی دیواروں نے جو کُچھ سُنا اور جو کُچھ دیکھا آپ کبھی اُن سے ضرور پُوچھ لینا مجھے یقین ہے کہ وُہ کُچھ نہ کہہ پائیں گی۔ دیواریں اِتنی سنگدِل نہیں ہو سکتیں کہ اِتنی رُوح فرسا کہانی کو لفظوں میں بیان کر دیں۔ ہاں، دیکھ لینا اُن کی رگوں سے خُون ضرُور بہنے لگے گا۔ اور اُن کے بین آپ کو کُچھ بھی سُننے نہیں دیں گے۔ دِل چیر دینے والی کہانیوں میں لفظ کہاں، لہو ساتھ دیتا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی بیوی کی خِدمت کے لیے مجھے آتے جاتے رہنا پڑے گا۔ کیوں کہ وُہ میرے بغیر جینے کا تصوُّر بھی نہیں کر سکتا، اُس کی بیوی اکثر بیمار رہا کرے گی یعنی جب بھی وُہ کہیں جائے گی۔ فرشتہ بابا کو اُس کی بیماری کی خبر دے گا۔ یُوں بابا کو اس بات کی ہَوا بھی نہیں لگے گی اور مَیں اُس کے اور وُہ میرے سارے سپنے بھی پورے کر دے گا۔ ضرورتوں کا سر کچل کر مجھ جیسی کتنی لڑکیاں مصلحت کا زہر پی لیتی ہَیں۔

مَیں نے ایک لمحے کے لیے اِن ساری پیش کشوں پر غور کِیا۔ جو جگ مگ جگ مگ کرتے ہیروں کے تھال میں رکھ کر میرے سامنے رکھی گئی تھیں۔ پھر بابا کی آنکھوں اور اپنے دِل میں جھانکا..... ہم دونوں نے لات مار کر تھال کو دور پھینک دیا تھا۔ اِنکار کی صُورت میں اُس نے جو کہانیاں مجھے سنائیں، وُہ بھی آپ اُس حویلی کی دیواروں سے سُن لیجیے گا۔ کیوں کہ رات کے نالے اتنے بلند ہونے لگے ہَیں کہ مجھے ڈر ہے اُن کی آوازوں سے ہمارے کچّے مکان کی دیواریں نہ ڈھے جائیں۔ آسمان کا چہرہ اِتنا سیاہ ہونے لگا کہ مجھے خدشہ ہے اِس تاریکی میں کُچھ اور فاختائیں رستے سے نہ بھٹک جائیں۔ عامر صاحب! مَیں بُزدِل نہیں ہُوں۔ مَیں نے بڑے ہی سخت دِن دیکھے ہَیں۔ بھوکا رہنے کا دُکھ، عید پر اُترن پہننے کا دُکھ، بالی عُمر میں اپنے ہی بہن بھائیوں کی ماں بن جانے کا دُکھ اور ہستی سے نیستی میں ڈھل جانے کا دُکھ۔ مگر آپ بتائیں! مَیں بابا کو کیا بتاتی؟؟۔ مَیں کیسے ہر روز اُس کی بیوی کی عیادت کو جاتی؟؟ اور بابا کیا کر لیتا؟ وُہ تو اُس کو فرشتہ سمجھتا تھا۔ مَیں کِس اُمّید پر صبح کا اِنتظار کرتی؟؟ عامر صاحب! ایسی کئی سُہانی صبحوں میں مرنا تو پھر بھی ہم جیسی لڑکیوں کو ہی پڑتا ہے، پھر میرا یقین بھی کون کرتا؟ فرشتے ضمانتوں اور جھوٹے الزاموں کا دُکھ مُنہ پر سجا کر آزاد پھرتے رہتے ہَیں۔ مَیں اپنی تصویر بھی آپ کو بھیج رہی ہُوں۔ دیکھ لیجیے کہ مَیں کتنی خُوب صُورت ہُوں اور لوگوں کو بتا دیجیے گا کہ دولت کے انبار پر کھڑے ہوئے فرعون حُسن کو سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر سزا بنا دیتے ہَیں۔ یہ بھی لِکھیے گا کہ لوگ بے چارے اپنی خباثت پُوری کرنے کے لیے جتنی چاہیں شادیاں کر لیا کریں۔ مگر معصُوم پرندوں کے پر نہ نوچیں۔ مگر عامر صاحب! میرا نام مت لِکھیے گا کیوں کہ ہم دونوں میں سے ایک کو تو بہرحال مرنا ہی تھا اور مَیں نے زندگی بابا کو بخش دی ہے۔

غزل

بدر سیماب (کویت)

قصہ طویل تر ہے مگر کیجئے بھی کیا
اب وقت مختصر ہے مگر کیجئے بھی کیا

منزل سمجھ کے، ہم کو قدم روکنے پڑے
گرچہ یہ رہ گزر ہے مگر کیجئے بھی کیا

ہم نے سمجھ کے گھر یہ خرابہ بسا لیا
دیوار ہے نہ در ہے مگر کیجئے بھی کیا

عمر رواں میں دوستو! مہلت نہیں رہی
کتنا حسیں سفر ہے مگر کیجئے بھی کیا

کیا جانیے کوئی ہمیں کب چھوڑ دے کہاں
ہر گام ہی یہ ڈر ہے مگر کیجئے بھی کیا

سیماب ہیں ضرورتیں الفت کہیں جنہیں
دل ہے کہ بے خبر ہے مگر کیجئے بھی کیا

قاتل کا سراغ

مبشر الیاس

جنگل کے بیچوں بیچ گزرتی ندی کے کنارے کسی پرندے کے پر بکھرے پڑے تھے۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا، مسلسل آٹھ دنوں سے اسی طرح کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ہر روز کسی نہ کسی جگہ پر جنگل میں کسی پرندے کے پر پڑے ہوتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ واقعات دن کو نہیں ہوتے تھے۔ ہمیشہ یہ پر صبح کے وقت ہی دیکھے گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ واردات رات کو ہی ہوتی ہے۔ اب پرندوں میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک دن اس جنگل سے پرندوں کا صفایا ہو جائے گا۔ آخر کب تک چپ رہیں؟

آخر چیل نے فیصلہ کیا کہ تمام پرندوں کا ایک اجلاس بلایا جائے اور اس اہم مسلے پر غور و خوض کر کے اس کا کوئی معقول حل نکالا جائے۔ اجلاس کے سلسلے میں ایک اور اہم مسلہ درپیش تھا۔ جنگل میں تو ان گنت پرندے تھے۔ اجلاس میں سب کو خطاب کا موقع دینا ناممکن تھا۔ چیل کی فطری ذہانت نے اس کا یہ حل نکالا کہ اگر ہر نوع کے پرندے اپنی اپنی نوع میں سے اپنا ایک ایک نمائندہ منتخب کر لیں تو یہ مسلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ اس طرح بآسانی تمام نمائندگان کو دعوتِ خطاب دی جا سکتی ہے۔ یہ اجلاس انتہائی اہم تھا کیونکہ اس میں پرندوں کی بقاء کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لئے حکمت عملی ترتیب دینے کی ٹھانی گئی تھی۔ چیل نے جب دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پرندوں کو بلا کر سب کی رائے لی جائے تو اس نے جنگل کے اونچے سے درخت پر بیٹھ کر یہ اعلان کیا کہ "اے جنگل کے پرندو! میرے پیارو اور اپنے والدین کے راج دلارو! آپ سب کے علم میں ہے کہ ہر رات کو اس جنگل میں ایک پرندہ انتہائی ظالمانہ طریقے سے قتل کر دیا جاتا ہے، اس قتل عام کے اسباب معلوم کرنے کے لئے اور اس کی مستقل روک تھام کے لئے کوئی مؤثر حکمت عملی وضع کرنے کے لئے ہم نے ایک اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر اپنی زندگی بچانا چاہتے ہو تو آج شام سورج غروب ہونے سے نصف گھنٹہ پہلے ندی کے کنارے اس جگہ پر سارے جمع ہو جاؤ جہاں آج صبح ایک پرندے کے پر پائے گئے۔ اس اہم اجتماع میں آپ سب کی شرکت بہت ضروری ہے، سبھی کے رائے مشورے سے ہی ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔" اس کے بعد نمائندوں کے انتخاب کا طریقہ بالتفصیل بتایا۔ اعلان ختم ہوا، بات کسی تک پہنچی کسی تک نہ پہنچی، بہرحال چیل نے اپنے تئیں اپنا فرض ادا کیا۔ دن گزرا ادھر شام ہونے کو آئی اُدھر پرندے غول در غول ندی کنارے اترنے لگے۔ کوئی زمین پر بیٹھ رہا ہے تو کوئی کسی درخت سے لٹک رہا ہے غرضیکہ ہر سمت پرندوں پر ہی نظر جاتی تھی۔ دو چار پرندوں کی آمد کے ساتھ ہی غل غپاڑہ شروع ہو گیا تھا اور اب تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر کوئی اپنا راگ الاپ رہا تھا، اپنے اپنے مشوروں سے ایک دوسرے کو نوازا جا رہا تھا۔ چپ رہنا یا کوئی مشورہ نہ دینا تو گویا اپنی شان کے منافی سمجھا جا رہا تھا۔ جس مقصد کے لئے یہ اجتماع کیا گیا تھا اس کا تو ابھی آغاز ہی نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ہر کوئی خود کو مشیرِ اعلیٰ، منتظمِ اعلیٰ یہاں تک کہ وزیر اعلیٰ بلکہ وزیراعظم تک ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں لمبی لمبی گھاس کی اوٹ میں بیٹھی تیتری اگر خود کو ملک برطانیہ کا جانشین ثابت کر رہی تھی تو اُدھر دوسری جانب چھوٹی سی جھاڑی پر مسند سنبھالے ایک بٹیر اپنے آپ کو شاہِ انگلستان کا اکلوتا وارث سمجھ رہا تھا بلکہ سمجھا رہا تھا!

اس سارے غوغا میں دو پرندوں کی عدم موجودگی ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔ بلبل اور کوئل دونوں غیر حاضر تھے۔ ان کی غیر حاضری پر سب سے زیادہ فکری مند ایک ننھی سی چڑیا کو تھی۔ چنانچہ چڑیا فوراً ہی اڑی اور جنگل کے کونے کونے میں لگی جھانکنے۔ ندی کے کنارے کنارے دور تک اڑتی ہوئی گئی اور ہر چٹان پر نظر دوڑائی۔ چڑیا ہر درخت کے پاس بھی گئی۔ بالآخر چڑیا کی محنت رنگ لائی اور اس کی آنکھیں بلبل کی تلاش میں کامیاب ہو گئیں۔ بلبل نے گلاب کے پھول کی صرف ایک پتی سامنے رکھی ہوئی تھی اور نظروں سے برگِ گل کا طواف جاری تھا۔ چڑیا قریب آئی پر بلبل کو اس کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی۔ چڑیا کو شرارت سوجھی، اس نے بلبل کے سر پر ٹھونگ ماری۔ ضربِ منقار سے بلبل جاگ اٹھی۔ سر اٹھایا، چڑیا کو دیکھا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ چڑیا بولی "اے عاشقِ لالہ وگل! چمن سے لائی ہوئی ان پتیوں کو چھوڑ اور اپنے مستقبل کی فکر کر!"

بلبل: کیا ہوا میرے مستقبل کو؟

چڑیا: جب سارے جنگل کے پرندوں کے سروں پر موت منڈلا رہی ہے تو تُو کس کھیت کی مولی ہے کہ تجھے بخش دیا جائے گا؟

بلبل: موت سے مجھے مت ڈرا، سیدھی طرح آنے کا سبب بیان کر!

چڑیا: بے خبر کہیں کی! سن! میں تجھے جگانے آئی ہوں

بلبل: پھر وہی الٹی سیدھی باتیں؟

چڑیا: یا سیدھی ہوتی ہیں یا الٹی۔ یہ الٹی سیدھی کیا بلا ہے بہن؟

بلبل: چل راہ لے اپنی! چھوڑ میری جان!

چڑیا: تیری جان میں نے کب پکڑی ہوئی ہے، وہ تو تیرے سامنے پڑی ہے۔ تیری جان تو یہ پتی ہے۔

بلبل: (لاجواب ہو کر اکتاتے ہوئے) چرب زبان! جاتی ہے یا تیرا سر پھوڑ دوں؟

چڑیا: غور سے میری بات سن!

بلبل: اتنی دیر سے کس کی بک بک سنتی رہی ہوں؟ اچھا اچھا وہ تیرے اوپر مسلط شیطان کی آواز تھی! چل اب تو بھی بول لے!

چڑیا: کمبخت! چل ندی کے کنارے!

(بلبل پہلے ہی چڑیا کی اتنی لمبی بحث سے اکتا چکی تھی، تلخی سے بولی)

بلبل: کیوں؟ کیا وہاں تیری ماں سے تیرا رشتہ پوچھنا ہے؟ پاگل میرا تو بچہ ہے ہی نہیں جس کے لئے رشتہ

پوچھوں! اور ہوا بھی تو تجھ جیسی منہ پھٹ کو میں گھر میں نہیں لانے کی!

چڑیا: آج تو اس طرح زبان چلا رہی ہو جیسے محلے میں دو بوڑھیاں لڑتے وقت چلاتی ہیں

بلبل: ہاں ایک بوڑھی میں اور دوسری بوڑھی تو!

(چڑیا اس ساری بحث سے محظوظ ہو رہی تھی لیکن اب بحث کو مزید طول نہیں دینا چاہتی تھی اس لئے اصل مدعا کی طرف آئی)

چڑیا: اچھا اب تو تم نے خود ہی تسلیم کر لیا ہے کہ میں بڑھیا ہوں، بڑھیا! تم یہاں عشق لڑا رہی ہو اور جنگلی پرندوں کی زندگی شدید خطرے کی زد میں ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ روزانہ رات کو جنگل کا ایک پرندہ مار دیا جاتا ہے؟

جب چڑیا نے بڑھیا کہہ کر مخاطب کیا اور عشق بازی کا طعنہ دیا تو بلبل طیش میں آئی لیکن جب اس نے پرندوں کے مرنے کی خبر سنی تو سب کچھ بھول گئی اور خون کی سرخی خیالوں کے لالہ زار میں بھر گئی۔ پھر دکھ بھرے لہجے میں یوں گویا ہوئی

بلبل: میرا کیا ہے میں تو موت کو ہتھیلی پر لیے پھرتی ہوں، افسوس تو ان پرندوں کا ہے جو امنگوں سے بھرپور زندگی جی رہے ہیں۔ اگر کسی نے ان کی دشمنی کی ٹھان لی ہے تو ہم نے جی کر کیا کرنا ہے۔ مجھے بتاؤ اگر میری جان کی قربانی باقی پرندوں کو بچا سکتی ہے تو میں حاضر ہوں۔

چڑیا: واہ! جان دینے کی بات تو کرتی ہو لیکن پرندوں کی جان بچانے کے لئے مناسب اقدامات سوچنے کی خاطر کئے گئے اجتماع میں شرکت سے کنی کتراتی ہو۔

بلبل: کونسا اجتماع؟ کیسا اجتماع؟ اری کچھ منہ سے پھوٹ تو! کچھ بولو گی تو مجھے پتہ چلے گا نا کہ کیا اجتماع اجتماع گا رہی ہو

چڑیا: ہائے! کیا بتاؤں تجھے

بلبل: وہی بتاؤ جو بتانے کے لئے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے

چڑیا: تو سنو پھر! ہر رات کو ایک پرندہ مار دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ کئی راتوں سے جاری ہے۔ مارنے والے کا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ پرندوں کے اس قتل کی روک تھام کے لئے کوئی مستقل حل سوچنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بس اسی مسئلے کا کوئی حل سوچنے کے لئے جنگل کے تمام پرندے ندی کے کنارے اس چٹان کے پاس جمع ہو رہے ہیں جس کا قد انسانی قد کا دوگنا ہے۔

بلبل: یہ بات تھی تو تم نے اتنی لمبی تمہید کیوں باندھی، آتے ہی مجھے اصل بات کیوں نہیں بتائی؟

چڑیا: بڑی بی اب تو بتا دیا ہے نا، اب گفتگو کو طوالت کون دے رہا ہے؟ تم یا میں؟

بلبل: زیادہ باتیں نہ بنا، چل اب مجھے تیاری بھی کرنے دے۔ جانا ہے اجلاس میں بھی۔

چڑیا نے کوئی بات نہ کی اور پُھر سے اڑ گئی

اب چڑیا سیدھی کوئل کے پاس پہنچی۔ چڑیا نے جوں ہی " کوکوکوکو" کی ہلکی ہلکی آواز نکالی تو نغمہ طراز کوئل چونک سی پڑی۔ اس کے شیریں نغمے میں چڑیا نے نمک کی ہلکی سی چٹکی پھینک دی تھی۔

کوئل: میری نقل اتارنے چلی ہے کمبخت! کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا

چڑیا: (ہنس کر) کوئل چلی نصیبو لال کی چال اور اپنی بھی بھول گئی

کوئل: جس مقصد سے آئی ہو وہ بیان کرو، چٹکی بھر تو تمہاری حیثیت نہیں اور موازنے کرتی ہو مطربانِ خوش الحان کے!

چڑیا: خوش الحانی کیسی جب نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

کوئل: بانس کی بچی سیدھی طرح اپنے آنے کا مدعا بیان کرو ورنہ جاؤ

چڑیا: مینا کے خاتمے کے بعد قلقلِ مینا کا وجود کیسے قائم رہ سکتا ہے؟

کوئل... بانس سے اتری ہو تو مینا پر جا بیٹھی ہو! واہ رے چڑیا! اگر یونہی ایک چیز سے اتر کر دوسری چیز پر بیٹھ کر چہچہانا ہے تو جاؤ کہیں اور یہ کام کرو، مجھے میرا کام کرنے دو

چڑیا: میں تو چلی ہی جاؤں گی پر کچھ دنوں کے بعد تم بھی چلی جاؤ گی عالمِ عدم کی طرف!

کوئل: وہاں تو سب نے جانا ہے

چڑیا: پر اس جنگل کے پرندے بہت جلدی جا رہے ہیں اور اگر اب بھی نہ جاگے اور تمہاری طرح مست و بے خود رہے تو بہت جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند کی وادیوں کی طرف دھکیل دیے جائیں گے

کوئل: تم کہنا کیا چاہتی ہو آخر؟

چڑیا: میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم یہاں بے خبر گا رہی ہو اور جنگل کے پرندوں کی زندگی خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ ہر رات کو ایک پرندہ ہلاک کر کے نگل لیا جاتا ہے لیکن قاتل کا سراغ ہنوز نہیں ملا۔ یہاں بیٹھ کر اپنے گلے کا جادو جگانے کی بجائے اس اجلاس میں چلو جو آج شام ندی کنارے منعقد ہو رہا ہے اور جس میں اس بات پر غور کیا جائے گا کہ جنگل کے پرندوں کی زندگی بچانے کے لئے کیا کیا جائے۔

کوئل: اچھا یہ بات تھی! تم نے آتے ہی مجھے کیوں نہیں بتایا؟

چڑیا: کیونکہ تم راگ رنگ میں مشغول تھیں

کوئل: تم نہیں باز آنے کی

چڑیا: نہیں

کوئل: جاؤ، تم سے بحث فضول ہے۔

چڑیا: کیوں جاؤں؟ تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی

کوئل: کیوں؟ مجھے ڈر لگتا ہے؟

چڑیا: ڈر تو نہیں لگتا لیکن میرے جانے کے بعد تم یہیں بیٹھ کر پھر سے اپنا تماشا شروع کر دو گی

بلبل: جاؤ جاؤ، آ جاؤں گی میں!

چڑیا بغیر کچھ کہے اجلاس والی جگہ کی طرف اڑی۔ جب چڑیا وہاں پہنچی تو بلبل کو چونچ میں پھول لئے ایک درخت کی مغرب کی طرف جھولتی شاخ پر بیٹھے پایا۔ پرندوں کے درمیان بحث مباحثہ جاری تھا۔ اجلاس کا وقت ہو چکا تھا لیکن ابھی تک چیل نہیں آئی تھی۔ پیغام دے کر واپس آنے کے چند ہی لمحوں بعد کوئل پہنچ گئی۔ وہ چڑیا کے قریب ہی ایک نیم خشک ٹہنی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چیل بھی پہنچ گئی۔

اجلاس کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ ایک بٹیر چٹان کے پاس موجود ایک چھوٹے قد کی گھنی جھاڑی پر بیٹھا اور ہر نوع کے پرندوں کے نمائندگان کے نام باری باری پکارنے لگے۔ ہر پرندہ اپنی باری پر سامنے موجود چٹان پر آ کر کھڑا ہو جاتا اور متعلقہ موضوع پر تجاویز پیش کرتا۔ سٹیج نما اسی چٹان پر چیل بھی بیٹھی تھی۔ وہ ہر ایک کی بات کو بغور سن

رہی تھی۔اس نے اپنے سامنے تھوڑی سی مٹی بھی ہموار کر کے رکھی ہوئی تھی کیونکہ چٹان پر لکھنا تو چیل کے لئے ناممکن تھا لیکن کچی مٹی پر پنجوں کی مدد سے بہت آسانی سے لکھا جا سکتا تھا۔وہ اہم نکات لکھ رہی تھی۔ہر پرندے کی باتوں میں سے جو اہم سمجھتی لکھ لیتی۔مختلف آراء پیش کی گئیں لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ سب سے پہلے قاتل کا سراغ لگایا جائے۔ہر کوئی اس اہم نکتے پر زور دے رہا تھا کہ کسی طرح قاتل کو ڈھونڈا جائے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک مجرم کا پتہ ہی نہ ہو تب تک محض مجرم کو پکڑنے کے منصوبے بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔بہر حال ہر ایک کو خطاب کے لئے اتنا وقت ملا جتنا اس نے چاہا۔ہر ایک کھل کر بولا۔بالآخر رات گیارہ بجے تک تمام پرندوں کے خطابات کا اختتام ہوا اور جنابِ زغن کو خطاب کی دعوت دی گئی۔پر سنبھالے چونچ اٹھائے جنابِ زغن نے چٹان پر کھڑے ہو کر یوں خطابِ لاجواب کا آغاز فرمایا"اے قاتلِ طائرانِ بیابان! تجھے خبر ہو کہ تیرے حساب کا وقت آن پہنچا۔۔۔"اور جوں ہی "پہنچا" پر آپ کی منقار مبارک پہنچی تو آپ لڑکھڑا کر ذرا سی پیچھے کو گریں،اپنے بھاری بھرکم جسم پر قابو نہ پا سکیں اور ندی میں جا گریں۔پانی کا بہاؤ کچھ تیز تھا،آپ کو بہالے گیا۔پرندوں نے اڑ اڑ کر ندی پر سے چیل بی کا آخری درشن ضرور کیا لیکن انکو نکالنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ندی میں اترنے کی کوشش کسی نے نہ کی۔بہر حال سوگوار ماحول میں اجلاس کا اختتام ہوا اور آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنے کے لئے اگلی صبح کا وقت مقرر کیا گیا۔اگلی صبح آئی لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ جنگل میں کہیں بھی کسی پرندے کے پر، ہڈیاں اور خون نظر نہیں آیا۔یعنی آج رات کوئی پرندہ ہلاک نہ ہوا تھا صبح کے وقت ندی کنارے پرندوں نے اکٹھا ہونا تھا سو ہو گئے۔آج ہر ہر پرندہ یہی کہہ رہا تھا کہ چیل نے پرندوں کی بقاء کی خاطر اپنی جان دے دی۔یہ اجتماع ایک قسم کا تعزیتی ریفرنس بھی تھا۔بٹیرا اپنی مقررہ جگہ پر پہنچا اور سب سے پہلے چڑیوں کی نمائندہ اسی چڑیا کو دعوتِ خطاب دی جو بلبل اور کوئل کو اجلاس میں شرکت کے لیے بلا کر لائی تھی۔چڑیا چٹان پر پہنچی اور یوں حاضرین سے مخاطب ہوئی"اے جنگل کے پرندو! گزشتہ شب دورانِ خطاب محترمہ چیل جان اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ان کے اہل وعیال اور اعزہ واقارب کے دکھ درد میں جنگل کے تمام پرندے برابر کے شریک ہیں۔آپ انسانی سیاسیات سے نہ صرف بخوبی واقف تھیں بلکہ انسانی سیاسیات کے تمام اصولوں پر عمل پیرا بھی تھیں۔انسانی سیاسیات انتہائی پیچیدہ موضوع ہے اور اس موضوع پر مہارتِ تامہ یقیناً چیل کی ذہانت و فطانت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔آپ نے عمر بھر انسانی سیاسیات کے اصولوں کو چراغِ راہ بنائے رکھا،آپ کی زندگی کے آخری ایام بلکہ آخری لمحات بھی اس کے گواہ ہیں۔انسان اشرف المخلوقات ہے،اس کی سیاسیات کو مجھ جیسا حقیر پرندہ کیا سمجھ سکتا ہے!پھر بھی میں نے انسانی آبادیوں میں گھوم پھر کر جتنا مشاہدہ کیا ہے آپ کے گوش گزار کرتی ہوں۔انسانوں میں سے جتنے بھی سیاستدان ہوتے ہیں وہ زندگی بھر جھپٹ جھپٹ کر مفلس اور نادار انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں لیکن اس کے باوجود عوام کی نظروں میں ہمیشہ اچھے،شریف اور اعلیٰ حسب نسب کے حامل رہتے ہیں۔موت وحیات نہ انسان کے ہاتھ میں ہے نہ کسی اور مخلوق کے ہاتھ میں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ یہ انسانی سیاسیات کا سکھایا گیا کوئی گُر ہے یا عوام کی آنکھوں پر بندھی ہوئی کوئی پٹی کہ یہ سیاستدان جب اس جہانِ فانی کو بادل ناخواستہ الوداع کہہ جاتے ہیں تو عوام میں یہ بات مقبول ہو جاتی ہے کہ دیکھو کتنا بڑا لیڈر تھا،عوام کی خاطر جان دے دی۔یعنی بچے پر جھپٹا لیکن بچے کے باپ کی نظر میں مقدس ہی رہا اور جھپٹتے ہوئے کہیں گر کے راہیِ ملک عدم ہو گیا تو پہلے سے زیادہ محترم ہو گیا۔یہ ہے انسانی سیاسیات!لیکن ابھی تک ہم پرندوں کی دنیا بہت پیچھے ہے ترقی کی دوڑ میں۔ہم ابھی تک انسانی سیاسیات کو نہیں سمجھ سکتے۔انسان شعور کی ان منزلوں پر پہنچ چکا ہے جن کا ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔انسان اپنے ہم نفسوں کو بھنبھوڑ ڈالتا ہے لیکن پھر بھی ان کی نظروں میں عظیم ہی رہتا ہے... یہ سلیقہ ابھی تک پرندوں کو نہیں آیا۔البتہ گزشتہ شب اس دنیا سے گزر جانے والی چیل جان صاحبہ عالمِ سیاسیاتِ بشر تھیں۔محترمہ چیل جان کو انسانی سیاسیات کے تمام اسباق ازبر تھے۔بہر حال اس سیاست کو سیکھنے کے لئے پرندوں کو ہنوز ایک طویل عرصہ درکار ہے۔"

بیج کے محافظ

فوامن ترکی 1940

مترجم ڈاکٹر خالد سہیل

ہماری زمین جلا دو
خواب جلا دو ہمارے
شہیدوں کے خون پر مٹی پھینک دو
ہمارے قیدیوں کی چیخوں کو
اپنی مشینوں کے شور میں گم کر دو
ہماری دھرتی کو تباہ کر دو
ہمارے کھیتوں کو تاخت وتاراج کر دو
ہمارے بزرگوں کا بنایا ہوا
ہر شہر، ہر قصبہ
ہر گھر، ہر درخت
ہر کتاب، ہر قانون
بموں سے مسمار کر دو
تم
ہمارے ماضی
ہمارے ادب
ہمارے استعاروں
کو نیست ونابود کر دو
تم یہ سب کچھ کر لو
اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ جی چاہے تباہ کر دو
مجھے تمہارے ظلم کی کوئی
پرواہ نہیں
کیونکہ میں نے ایک بیج بچا کر رکھا ہے
وہ بیج ایسے درخت کا ہے
جو میرے اباؤ اجداد سے
نسل در نسل
منتقل ہوتا چلا آیا ہے
اور وہ بیج ایک دن
میں اپنے وطن کی دھرتی میں بوؤں گا

مات

میکسم گورکی/شاہ محمد مری

اولی بہر

1

مزدورانی بستی ئے دونہو او لیغاروئیں آزمانہ لافا فیکٹری ئے تُو تُو آ ہر ردش لڑزینوخیں گُر ہاٹ کٹ۔غم جث و بیزاریں انسان دانڑتی ساہی دیوخیں وہاواژہ سیر نہ ویث انت کہ تُو تُو ئے ہمے واہوآ ہاغہ کٹ انت۔آں وثی کسن ایں کچوئیں لوغاں ژہ ہژ مبثغیں جُو جوآنی ڈولا درکپثنت۔آں ساڑت وتہاریں ساہتا کچوئیں سڑکہ چکا فیکٹری ئے ہماں بڑز وکوہیں بلڈنگہ پلوہ سرگپت انت کہ لاتما وہشکیں بے پرواہی آ گوں آنہاں پہ ہیل اث، او وثی بے اشماریں چیار کنڈیں کھڑکیانی روغن ایں چماں گوں سڑکا روژنا کنغایث۔آنہانی پاذانی شیرا گپ وآف چیتاڑے جیغاثنت۔آنہاں وثی وہاوینغایں گرائیں توارا گوں واہوداشتنت، زا اوگیث ئے ہلجا آ گوں ڈیھ پہ سرا زُرت۔وثی واہو چیکا پچی پجیا آنہانی گوشاں دوہمی لوادِہ کا تکنت۔مشینانی کوجھائیں ژڑونگھاٹ او بھاپ ئے کفشکاٹ۔فیکٹری ئے دراژ وسیاہیں دودکش (چمنی) سوٹایانی ڈولا بستی چکا ہژمبینوخی آڈولواث۔

روش ٹُب آ لوغانی کھڑکیانی اندرا مثغیں ساکہ دیثث تو فیکٹری آ وثی کوہیں سغندانا ژہ مردم ہمنگا چغل داشث چوکہ آں بس لیغارثنت۔ہماں مخلوک اغدہ سڑکانی چکا کاتک .... گریس آ ترِ بڑتی آ او چرپیں سیاہیں دیماں گوں۔آنہانی شنذی ایں دتاں جلشکشث او آنہانی جانا ژہ مشینہ تیل ئے بریں بوکا تک۔نیں آنہانی توارزیات تازہ ات، جوش او مستا گا پرات.......... کہ یک دگہ روشے ئے کار ختم بیثہ، اولوغانغن او وہاوآنہانی انتظار اشث اتنت۔

روش فیکٹری آ لوہڑ شہ، مشیناں مزدورانی ہون وثی گزرے کچا پرنچ اثغث۔روشاناشیکیں نشانی اے دہ نہیشتہ او کٹُشہ۔او انسان وتی قبرہ پلوا اغدہ یک گامے آ ودھشہ۔پرنیں ہر یکے آرام، او دونہوآ پریں شراب خانہ ئے چسانی ہیل منداث، ہمے حاطرا دل وہش اشنت اِش۔

سنڈے او موکل ئے دوہمی روشاں آں صحبہ دہ بجہ آ داں وپثنت او گڑہ پیرنڈ او، سیر ولوغی مرداں وثی پاک او اچائیں جر جانہ کشث او عبادتہ شثنت۔دگ آ ورنا مذہبا ژہ دِیری ئے سرابذ وزد کث انت اش۔عبادتا رند آں لوغہ کاتکنت، ہاخے پُرے وارت اش او اغدہ بیگھا داں وپثنت۔

سالانی مانغانیاں اواربیثو آنہانی شُذ اُصل ختم کثغث۔ہمے سبا آنہاں شراب واری آ گوں شنذہ ودہینغہ کوشیش کث او ''واڈکا'' ئے تلخ ایں ڈَنگ او کنٹغاں گوں وثی لاف عذاب کث۔

بیگھاں سیلہ درکپثنت۔ڈغارستر ہشک بیثے گڑہ دہ ہرکسے آ گوئر کہ ہورے ربڑیں بوٹ استثنت، پاذہ کثتی اوستر روش درکپتیا بیثے گڑہ دہ ہرکسے آ گوئر ہورانی سرسائے استث زڑتی۔

آ پتیا یکو فیکٹری، مشین او فورمینانی پچار کث اِش۔آنہانی سجہ ایں مجالس وثی زیند او کار ئے بارواث۔کزنہی وختے، مڑاروئیں خیالانی رولوئیں چڑنگ آنہانی زیند ھئے بے رنگ او بے کیفیں یکسانیتہ اندراٹمکث انت۔لوغہ کاتنت تو وثی زالاں گوں اڑثنت او چماٹ ولٹاں گوں کٹ اشنت اِش۔ورنا شراب خانہا شثنت یا وثی سنگتانی لوغاں۔اکارڈین، وجینت اش، بے وزنیں کوجھائیں شیرجثنت، چاپ او دھرلیس کث، زاگیث کث ومست بیث انت۔پچے کہ آں گرانیں پورہاتاں مانینت او ٹکرٹکر کثغ اشنت ہمے خاطرا یک دم نشہ آ گپثنت، او یک عجب ایں نازانتیں ڈکھاے آ آنہانی ڈوبراں پشیمانی اے پیدا کث کہ درا درکفغ ئے راہ پولثی۔ہمے سبا آنہاں تسلی دیغ ئے موقع دہ یلہ نہ داث، او کستریں ٹوکانی چکّا آنہاں رسترانی ڈولا یک دوہمی سرا اُررِش کث۔نتیجہ اے بیث کہ ہوں ریشی بیث۔بازیں وختاں ہمے مڑائیاں بازیں مرد ٹپی بیث انت او وختے وختے تہ کشث وکوش دِہ بث۔

آنہاں آپتی آ دِہ کست او دژمنی ئے سیادی داشتنت۔او ہمے ٹوک ہمکر کہن اث چوکہ آنہانی ہڈ و گوژد ئے دراہ نہ ویوخیں مانغانی کہن اث۔آں روح ئے ہمے نادراہی آ پچی آ پیدا بیثث کہ ژہ پث و پیرکانی پلوا میراتی رست اِش او تہاریں سائے ڈولا داں مرگا ہمشانی سنگت اث او شانہاں ہمنگیں کارکنائیں تنتی کہ آں وثی احمق ایں بے رحمی سبا سک قابل نفرت معلوم بیث انت۔

سنڈے آں موکل اث۔ ورنا شفا دیر گرٹ کاتکنت۔.........پچ دڑتی آ، سرداں پاذاں ہا خاں ہا خولی کثی آ، گپاں لڑثی آ، چم سیثی آ، پونزا ہوناں چُرینانں........ آں وختے وث گلائی آ کناناں کاتکنت او وختے وثی بے عزتی سرا مونجھا، زہرن او گرے آناں کاتکنت۔آں نشہ آ گپث مست او، بزگ او، دربدر کثنت۔

بازیں وختاں مات او پثاں وثی بچ کہ نشہ آ بے سدھی آ شراب خانہ ای فرشے چکا، یا بھت اے سایا کپتی آ دیثث اولوغہ کاڑتنت تو زہر گپثنت او بذ ورذ گوئشتنش، بازیں شراب واریاں ژہ نزور بیثغیں آنہانی جان باز کٹث اِش او فکرمندی آ گوں کٹہ سرا وافیں تنت اش۔پر ہمے زہر بس صحبا داں بیث چے آ کہ کارخانہ ئے تُو تُو ئے چینہاٹ پذی شف ئے ڈوبراسیاہیں لیکے ڈولا چیراناں اندر اپیہہ اث تو آں یک دم ہاغہ کنغ بیثنت۔

پر، ورنایانی مڑائی او شراب واری یک

حقیقتے ڈولا ہر کسا مشغ اث ۔ پچیکہ پٹ وثی ورنائی وختا دِہ ہمنگا مڑثنت او شراب وارت و انوش بیثنت ۔ او آنہانی ماث وپثاں دِہ آں ہمے رنگہ جت او کٹ اثنت ۔ زیندھ ئے رنگ یکو ہمش اثنت ۔ زیندہ سالانی سالاں ہمے لڑدیں کورئے ڈولا بہنداث، مذام مذامی آ، یک بھیری آ ۔ ہمے یک بھیری، یک رنگی ئے عادت کہ پاڑ اِش باز ڈونگھا او استور اثنت، کل چیزاں تکڑائی آ یک ہندے آ بستیا یث۔ ہچ کسے اندرا کسترڑوئیں خواہشے دِہ نہ یث کہ ہمے زیندھ لافا تبدیلی ئے بیاری۔

وختے وختے دوہمی ڈیہاں ژہ نوخیں مڑدم پہ ساہڑغا فیکٹری بستیءَ کاتکنت ۔ سری سری نوخ آتکی سبا مخلوکہ آنہانی پلّوہ دلگوش کث، پر پڈا ہمے توجہ ساڑت بیث او چھڑو دوہمی ہندانی (کہ اوذا اکار کث اش) قصہانی سبا چیزے دلچپسی برجاہ داشت۔ پر، ہمے نوخی تکائی ہلاسہ بیث ۔ مخلوک ولدءَ بٹ او ہما نہانی پلوا دلچپسی کُٹ اث ۔ نوخ آوَخانی ٹوکاں ژہ سہرابث کہ پوریا گرانی زیندھ ہر ہندے آ یک ڈول اَیں، او اغر ہمے ٹوک راست اث تو گڑہ پہ کنغا چے ٹوکے سرہ کیث ؟۔

پر، ہمے نوخ آوَخاں کڑدے ہمنگیں ٹوک کشت کہ بستی والایاں پہ نوخ اثنت ۔ بحث تہ کسہ نہ خث پر ہما نہانی ٹوک گوں شکا اَش کث اش ۔ کڑدے ہمے ٹوکانی سرا بے سبی آ زہر گپت۔ کڑدے ہمے ٹوکاں ژہ ہڑمبث ، او کڑدے آ امیدئے ناشیکیں لانٹے اندرا خطرہ کپت۔ او ہمے سبا آنہاں اغدہ زیات شراب واڑت کہ ہمے ناوشیں خطرہاں دلا ژہ کشتہ کن انت کہ زیندھ اغدہ زیات پیچیدہ ٹاہین انت۔

بستی والایاں اغر نوخ آوَخے لافا شک مندیں ٹوکے دیثیں تو دیرداں ہمے ٹوک وثی دلہ داشت اش ۔ آں ہر ہماں مرد اژہ خبردار بیثنت کہ ہما نہانی جندہ ڈو لینے مہ ویثیں ۔ بزاں خطرہ اث اش کہ ہمے مڑد آنہانی زیندھئے موںجھائیں یک بھیریں باقاعدگی آ لوڑ گوڑ کنت ۔ چیا کہ آنہانی زیندھ ستر کہ ڈکھیاث پر کم از کم خاموش او چپ چاپ تہ است اث ۔ آنہاں عادت بیثہ کہ زیندھ بلّاں ہمے یکیں بھیرا آنہاں ویلاں داث ۔ او پچیکہ آنہاں جوانہئے ہچ امید نیستہ ہمے حاطرا آں پک اثنت کہ ہر تبدیلی اے آنہانی ڈکھاں گیشہ کنت ۔

آنہاں چُپیا شماں مڑدہ چمہ جث کہ نوخیں پکرے پیش داشتی ۔ ہمے سبا نوخ آوَخ موڑی سر شموذاں ششت ۔ اغر کزینہی کسے مہ ششیں او ہمیذا کارکشینی تو یاتہ سوکا سوکائی دوہمیانی ڈولہ بٹ یا گڑہ شما نہاں جذا او تنیا وثی زیندھئے گوازینغہ شروع بٹ.......... اندازاً پنجاہ سال ہمنگیں زیندہے گوازینغا پڈا مردم مڑت۔

☆

وپٹسا روف /شان گل

روش کاینت، ہمنگیں موںجھائیں
کہ نفرت ترا اُوآرائینی
وثی گرّائیں گُٹا گوں، دورءَ بی ڈوبرتئ
او تہ پونشئے زہریں زوانا گوں

روش کاینت ۔ ۔ ۔ تہ حیران بئے کہ پچے
ہمنگیں دڑ ، ہمنگیں زہر
پچے اکھر ڈونگھا انت اشی بنزہ

غزل

زاھد راھی

منا زھیر دجنت برے برے
گمانی تیر جنت برے برے

گوات کیت جتِک دروشما
یات وگیر مِرنت برے برے

منی تھنائی ئے کوٹی ئے تھا
ایوکی ئے زِیر بلنت برے برے

چُنت رنگا منا بھر بھر کن ئے
بھت ئے لکیر ڈلنت برے برے

تو کہ بچکندئے گوں منا ماہل
مسک و ھیر رچنت برے برے

تو منی ھلکا راھگوزی بیائے
کنٹگاں دیر کنت ، برے برے

میتگ وھُسن ئے بادشاہ زاھد
منا پکیر گش اَنت برے برے

مطالبہ

عاطف توقیر

اے مِرے شہرِ شب آلودہ نگار وحشت
تیرے کوچے تیری گلیوں پہ گہن سا کیوں ہے
تیرے چہرے کو کیا کس نے یوں بارود آور
پھر سے بندوق کی گولی کا تماشا کیوں ہے

تیری گلیاں جو شبِ غم کی طرح لرزاں ہیں
انہی گلیوں میں نئے رنگ اُگا کرتے تھے
اب تیرے لوگ شکستِ غمِ وحشت والے
تھے ادارہ کہ جوتہذیب بُنا کرتے تھے

اک طرف ہاتھ کہ مانگ اپنی اجاڑے جائیں
اک طرف لوگ کہ لوگ اپنے ہی مارے جائیں
اک طرف ہاتھ کہ مٹی کی تجارت میں مگن
اک طرف لوگ کہ دکھ خود پہ اتارے جائیں

اک طرف وہ کہ طلب سانس کا تاوان کریں
اک طرف یہ کہ جو دشمن سے شکستیں مانیں
اِک طرف وہ کہ ہیں پروردہء خوف و دہشت
اک طرف یہ ہیں کہ خود سانپوں کو گھر میں پالیں

اک طرف بوٹ کہ خود اپنے گھروندے روندیں
اک طرف لوگ کہ گولی کی زبانیں بولیں
اک طرف وردیاں پہنے ہوئے یہ ہرکارے
اک طرف لوگ کہ دہشت کے نشانے تولیں

اک طرف لشکری ہر روز نئے وار کے ساتھ
اک طرف عسکری چلتے ہوئے ہتھیار کے ساتھ
کوئی سورج یہاں نکلے بھی تو کیسے نکلے
وحشتیں جڑ گئیں ہر کوچہ و بازار کے ساتھ

اب کوئی راہ نکلتی ہے تو مقتل کی طرف
اب کوئی شام ابھرتی ہے تو وحشت والی
اب کے بازاروں میں بکتے ہیں سہولت سے کفن
اور آنکھوں میں تھکن ہے کوئی دہشت والی

میرے لوگو! اے مِرے درد گزارے لوگو!
سانحہ وار کسی خوف کے مارے لوگو!
اب نیا ورد یہی ہے کہ تمہیں اٹھنا ہے
آیتِ صبح فروزاں کے کنارے لوگو

ہو زباں رنگ و ثقافت یا کوئی مسلک و دیں
یہ دراڑیں ہمیں ٹکڑوں میں پلٹ ڈالیں گی
ہو سیاست کی یا مذہب کی تجارت لوگو
یہ خلیجیں کہ صفوں ہی میں ضرر پالیں گی

روشنی کے لیے درکار ہیں گلیوں کو دیے
اور دیے وہ جنہیں خوں سے بھی نکھارا جائے
خوف ہے خامشی اور خوف کا رد آوازیں
اب جو چپ ہیں انہیں قاتل ہی پکارا جائے

☆

ضیابلوچ

ایک ہی سانس میں دم توڑ گئی رات کی چیخ
زندگی بول اُٹھی صبح کی للکار کے ساتھ !

موجِ پیہم کی طرح سنگِ سماعت سے گزر
خامُشی ! ٹوٹ نہ جا شیشۂ اظہار کے ساتھ

حرکت صوت کی کھینچے ہے خموشی کو بھی
فاصلہ چُپ کا کھنچا آتا ہے گفتار کے ساتھ

کیا بتاؤں کششِ شوقِ سفر کے اسرار
منزلیں اور پرے ہوگئیں رفتار کے ساتھ

طائرِ خاک نے ہریالی سے جوڑا ہے مجھے
مَیں کہ شاداب ہوا جاتا ہوں اشجار کے ساتھ

مَیں کہانی سے اسے روز مٹاتا ہوں ضیا
رنج لوٹ آتا ہے ہر دن نئے کردار کے ساتھ

پونم

آغا گل

یونس نے ریٹائر ہونے تک فکشن میں کافی نام کمایا۔شہرت کا حصول کبھی دشوار ہوا کرتا تھا۔مگر اب تو ایک کلک پر افسانہ مختلف ادبی تنظیموں، گروپس میں پہنچ جاتا۔ جسے روکنا بھی حاکموں کے لیے ممکن نہ ہوتا۔عبدالعزیز خالد، زاہدہ حنا کی طرح اس نے بھی تمغہ امتیاز وصول کرنے سے معذرت چاہی اس کی دانست میں اس قسم کا وارداتی تمغہ لینے سے نہ لینا قابل عزت تھا۔جیسے گاندھی، نہرو، ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت نے نائٹ ہڈ سے لاتعلقی کے باعث عزت پائی اور ٹیگور نے تاج کے منہ پہ دے مارا ورنہ تو افرنگ کی دہلیز پہ Sir ہو گئے۔اقبال اور Sir سید احمد۔

ادبی رسالے دم توڑتے جا رہے تھے۔احمد ہمیش کے ساتھ افکار، حسین انجم کے ساتھ طلوع افکار، آغا امیر حسین کے ساتھ سپوتنک ڈوب گیا۔کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ یوں ہی لکھے جا رہا ہے۔سماج اتنی تیزی سے بدل رہا ہے کہ ناول کے بعد ناولٹ، طویل افسانہ اور پھر افسانہ بھی افسانچہ میں منقلب ہوا جاتا تھا۔شاعر بھی اپنی دو سو برس قدیم زبان اور پیکان، تیر، خنجر، تلوار، آشیانہ دربان۔پیر مغاں، مغ بچہ، عطار کے لونڈے کے ساتھ اکیلا ہی رہ گیا تھا۔اس پہ متعدد ایم فل ہوئے تھے۔بی ایس کے تحقیقی مقالوں کی تو اسے تعداد بھی یاد نہیں تھی۔اسے شوق تھا کہ اس کے فکشن پہ ڈاکٹریٹ ہو۔بی بی نانی مزار اور بابا خرواری وہ منت بھی مان چکا تھا کہ جس روز اس کے فکشن پہ پی ایچ ڈی کی اجازت ملی وہ فوراً جا کر نیاز چڑھائے گا۔ریٹائر ہو کر وہ دلیر بھی ہو گیا تھا۔ورنہ تو سرکاری افسر کو ایف آئی اے۔انٹی کرپشن سپیشل برانچ آئی۔بی آر می ویجی لینس سیل اور افریقی مگرمچھ جیسا نیب بھی منہ کھولے سونگھتا پھرتا۔

سرکاری افسر ''رضیہ غنڈوں میں'' کی طرح وہ علی بابا تھا جو چالیس چوروں کو بھتہ دیتا خود کھپ جاتا۔مومل کے فون کو اس نے خاص اہمیت نہ دی جو اس پہ ایم فل کرنا چاہتی۔مارشل لاؤں، جنت جنت کھیلنے والوں قبر کو روشن اور کشادہ کرنے والوں نے ایک نئی کانگڑی جنریشن کی راہ ہموار کی تھی۔جو قبر سے پہلے موبائل میں لپٹی رہتی۔یہ موبائلی نسل سپر مارکیٹ کی سیڑھیاں چڑھتی ہانپ جاتی اور لڑکیاں بھی ڈھانچیاں سی سریاب روڈ کی طرح سیدھی نہ کوئی پیچ وخم نہ ہی کوئی نشیب و فراز۔ان کے چہرے بھی اکڑے اکڑے سے رہتے۔حتی کہ شرمانا Blush ہونا بھی محاورے میں ہی رہ گیا تھا۔کہاں وہ وکٹورین دور کی بات بے بات Swooning ہوتیں شرمیلی عورتیں۔جنہیں ہوش میں لانے کے لیے بھی الگ سے کمرہ ہوا کرتا۔لیکن Beggers Can't be choosers بھوکا تو سوکھی روٹی بھی کھا لیتا ہے۔بلکہ اسے چاند بھی رات کے سیاہ توے پہ پڑی روٹی ہی دکھائی دیتی۔یوں تو اس کے پاس اداسی ہی اداسی وقت ہی وقت تھا۔مگر اپنی اہمیت منوانے کو اگلی سہ پہر کا وقت دیا تاکہ لڑکی سمجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں۔

مومل نے سن رکھا تھا کہ یونس ایک دل پھینک افسانہ نگار ہے۔اس پہ جو لڑکی بھی کام کرے اسکی مدد کرتا۔ہے سخت ٹھرکی اسی لیے تو Picaresque ناول لکھتا ہے۔طالبات کو تو کم و بیش مقالہ ہی لکھ دیتا ہے۔عید نیا سال یا سالگرہ آن پڑے تو قیمتی تحفے بھی دیتا ہے۔اپنی آسانی کے لیے اس نے یونس پر ہی کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔حالانکہ نگران نے تنبیہ بھی کی تھی کہ کسی شریف فکشن رائیٹر پہ کام کرے یہ تو بڑا بدنام ہے۔مومل کو علم تھا کہ شریف بڑے بھائی کا کرتہ چھوٹے بھائی کا پاجامہ پہنے پھرتا ہے۔گلی میں لگے بجلی کے کھمبے کی طرح اس کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اپنی شرافت کا بینر اٹھائے سہما سہما پھرتا ہے۔

مومل کے والد اللہ داد نے بہت سے کام کیے مگر کسی مارشل لائی سرکار کی طرح افلاس گھر کی منجی پیڑھی پہ براجماں رہتا۔طاقت نہ رہی تو دری بچھا کر عدالتی برآمدے میں عرضی نویس بن گیا۔سبی کے تنور میں وہ پنکھے کی ہوا اور ٹھنڈے پانی کے لیے ترستا بھی مومل کو تعلیم دلواتا رہا۔مومل سیپ سے نکلا بصرہ کا موتی تھی۔وہ مکمل حسن تھی اگر قدیم ڈیلفی کے پجاری دیکھ لیتے تو Phryne کی بجائے مندر میں مومل کا بت سجا کر پوجا کرتے۔

والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے مومل اکثر اپنے والد اللہ داد کو تسلی دیا کرتی کہ وہ بیٹا بن کر دکھائے گی۔بیٹے تو زراعتی دور میں اہم ہوا کرتے تھے۔انڈسٹریل دور میں بیٹا بیٹی کا فرق نہیں رہتا۔عورت بھی گھیرے دار لباس کو تنگ اور طویل گیسو اسے نئے کٹ میں بنوا کر مشینوں پہ کام کرنے لگی ورنہ تو اسکا دوپٹہ ہی اسے مشین کی خوراک بنا دیتا۔وہ خود کمانے لگی تو اسے کسی ان داتا کسی سرتاج کی ضرورت نہیں رہی۔نہ ہی شوہر کی غلامی کے بعد ستر حوروں کی سردارنی بننے کا اسے شوق تھا۔

وہ غربت سے خوفزدہ نہ تھی بلکہ مسلسل لڑ رہی تھی۔غربت پر بڑھ بڑھ کر اپنے حسن سے حملے کرتی چلی گئی۔

مومل کی اعلی تعلیم کے لیے کوئٹہ آنا ضروری تھا۔اس نے گراؤنڈ فلور پر کرایہ کا فلیٹ لیا۔اور پھر حسن کی دیوی نے وہ فلیٹ ہی مالکانہ حقوق کے ساتھ اسے دلوا دیا۔مگر مومل کی نظر کینٹ پہ تھی جہاں امیر رہتے ہیں۔شہر میں تو دھنیئے پہنچے رہتے ہیں۔بالٹیاں پکڑے پانی کے لیے دوڑتے، بجلی اور گیس کے لیے سڑکوں پہ دھرنا دیتے کیڑے مکوڑے جو سپاہیوں کے بوٹوں تلے ہی کچلے جاتے ہیں۔

قدرت نے رزق کا وعدہ کیا ہے، حسن ذہانت دلیری تو بونس ہے۔جو مومل جیسی Chosen one کو ملتا ہے۔وہ اعلی نمبروں سے کیریئر بناتی رہی۔پھر ایک پرائیویٹ کالج کے مالک نے دوپہر کی کلاسز لیکچرز کی بنیاد پر ملازمت دے دی۔مالک کو عمر نے صائم بنا دیا تھا۔کتے فیل ہو چکے تھے۔حسن کو آنکھوں سے چاٹ چاٹ کر سرور لیا کرتا۔مومل کو دیکھ دیکھ جیتا۔اسکا حسن آنکھوں سے سکین کرتا بدن کی خوشبو سونگھتا جسم کی لرزش دیکھتا۔

یونس نے بہت سے ملازم رکھ چھوڑے تھے۔بچے اڑ اڑ کر دیگر شہروں ملکوں میں جا آباد ہوئے تھے۔بیوی بھی کینیڈا چلی گئی تھی۔

''میں اس خوفناک شہر میں اور نہیں جی سکتی جہاں صبح سے رات تک بھونپو چیختے ہیں۔امریکہ اور چین سے مال پکڑ کے سرکار دہشت گردی کرتی ہے۔تاکہ دونوں کے سامنے بے بسی دکھا کر اور مال پکڑے۔کوئٹہ شہر بکرا پیڑی ہے قصاب خانہ ہے''

بیوی چند ماہ تو فون کرتی رہی پھر کینیڈا کی برف اس کے جذبات پہ طاری ہو گئی۔کبھی کبھار فون آ جاتا۔اس میں بھی سارا وقت اپنی بیماریوں کا ہی تذکرہ جاری رکھتی۔یونس اپنی

سٹڈی روم میں پڑھ رہا تھا۔ یوں تو بیل کی ہلکی سی آواز اس نے بھی سنی۔ مگر وہ افسرانہ شترغمزے کہاں جاتے ہیں۔ رفیق نے مومل کے آنے کی اطلاع دی جسے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اچھی ریفریشمنٹ کے بہانے نکلنا چاہتا تھا۔ رفیق اس کا پرانا ملازم تھا۔ طویل رفاقت اور نمک خواری کے باعث امپورٹ ایکسپورٹ بھی کرنے لگا تھا۔ گمنام آلٹو میں اپنے گھر لے آتا اور پھر اس کے گھر چھوڑ آتا۔ رفیق کی آنکھوں میں مسرت تھی۔ گویا سٹوڈینٹ خوبصورت تھی۔ مومل کو دیکھ کر یونس نے خود کو سنبھالا۔ مگر کرنٹ کا پہلا جھٹکا جو اس نے کھایا مومل بھانپ کر بھی جمعہ خان بنی رہی۔ یونس کے احترام میں کھڑی ہوگئی۔ یونس نے دانت بھینچ کر چہرہ جذبات سے عاری کرنے اور چہرے پہ لاتعلقی پھیلانے کی کوشش کی مگر آنکھوں کی پر مسرت چمک وہ قابو نہ کر سکا۔ مومل نے تعارف کرایا اور ٹاپک بتایا۔ ''یونس کی سبالٹرن فکشن'' موضوع سے ہی یونس بہت مسرور ہوا'' واہ کیا بات ہے۔ ٹرم سبالٹرن فکشن بیسویں صدی کے وسط میں Coin ہوئی۔ ملک میں سب سے زیادہ یہ میں لکھتا ہوں۔ ویسے ساؤتھ انڈیا میں سبالٹرن فکشن بہت زیادہ لکھی جارہی ہے'' مومل نے بتایا کہ یہ موضوع اسکا اپنا آئیڈیا ہے۔ ورنہ گھسی پٹی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ جیسے سانچے میں کھٹا کھٹ ایم فل بنائے جارہے ہیں۔ وہ عمر کا احساس کم کرنے کے لیے حسین لڑکیوں کو مجبور کیا کرتا کہ برابری کی سطح پر بات کی جائے۔'' یہ آپ تو جاگیرداری کالونیل دور کا لفظ حضور، سر، آپ تو کب کا ختم ہو چکا ہے مجھے بھی تم بولا کرو'' لڑکی ہچکچاتی تو وہ لفظوں کی باڑ مارتا۔

''اے مالک تیرے بندے ہم۔ تھے ہم ہی ایک تیرے معرکہ آراؤں میں۔ انتہائی عقیدت میں بھی خالق کو آپ نہیں تم کہتے ہیں''

شخصیت کے دباؤ اور شعروں کی بارش میں وہ یونس کو تم ہی پکارنے پہ مجبور ہو کر پھر عادی ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ وہ اسے اپنا یونیورسٹی فیلو لگنے لگتا۔ اور یوں وہ غیر محسوس طور پر web Spider کے پاس چلی آتی۔

مومل نے دیکھا کہ یونس اتنا مضبوط نہیں ہے جتنا اس نے سن رکھا تھا۔ پہلی ہی شلک میں ندیوں کے کنارے کانپنے والے قاشوم کی طرح ڈھیر ہو کر Chauvisim Male کے Incubator میں جا گرا تھا۔ اب صرف ایک باڑ کی مار تھا۔'' سر آپ میرا مطلب ہے کہ تم کس قدر سمارٹ ہو۔ کتابوں کی چھپی تصویروں سے تو اندازہ نہیں ہوتا تھا'' یونس بادشاہ جہانگیر بن کر نور جہاں کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔'' ہاں کبھی مجھے لوگ Lady Killer کہا کرتے تھے۔ مگر عمر تو روند کر نکل جاتی ہے۔ کیا کروں'' پھر اس نے دل جیتنے کے لیے اپنے اکیلے پن کی بھیانک تصویر کھینچی تاکہ مومل کے دل میں عورت کا رحم جاگ اٹھے۔

''سر یہ گھر آپکا ہے'' مومل تصدیق چاہتی تھی۔

''اور یہ گاڑیاں یہ ہیوی بائیکس'' یونس ہنس دیا۔

''تم بھی کتنی معصوم ہو مومل کبھی کوئی کامیاب انسان کرائے کے گھر میں رہتا ہے۔ مجھے گاڑیاں دوڑانے کا شوق ہے اور بائیک تو میرا Craze ہے''

شکار اکیلا اور غیر مسلح ہے۔ Over Confident بھی ہے۔ مومل نے جانچا۔ بابا کو کتنا شوق ہے کہ کھلا آسمان چاند ستارے دیکھے۔ لان میں چہل قدمی کرے درختوں کے سائے تلے بیٹھے۔ یہ گھر اس کا آئیڈیل ہے۔ یہ میں بابا کو دوں گی''

ملازموں نے میز سجادی۔ مومل اس کے شاہانہ انداز سے متاثر ہوئی۔ قیمتی گھڑی، قیمتی انگوٹھی اس کی شاہ خرچی ظاہر کر رہے تھے۔ چائے کے بعد جب یونس نے سٹڈی میں چلنے کو کہا تو وہ بے تکلف بے خطر چل دی۔ لائبریری بھی اچھی تھی۔

''تم مجھے Synopsis تو بنا دو پلیز میں نے یوں ہی انٹ شنٹ بنائے ہیں'' وہ مچل گئی۔

یونس کیلئے دوبارہ ملنے کو اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ اس نے اگلے ہی روز کا وعدہ کر لیا۔'' تم بہت تشبیہات دیتے ہو۔ تمہاری اپنی Connotation اور Synonymous استعمال کرتے ہو۔ ایک لفظ میں مجھے کیا کہو گے؟''

یونس ہنس دیا'' پونم کہوں گا، بلکہ بس تم پونم ہو۔ میں زندگی کی اماوس۔ اماشیا سے گزر رہا ہوں۔ اکیلا پن اندھیرا جسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ تم پورن ماشی ہو۔ پونم بن کر میری زندگی میں آئی ہو''

وہ کھلکھلا اٹھی'' کس قدر حسین باتیں کرتے ہو زمین سے اٹھا کر آسمانوں پہ بٹھا دیتے ہو''

اس کے لیے یہ نیا نام نہ تھا۔ اس کے پرستار اپنے ذوق کے مطابق اسے مختلف نام دیتے آئے تھے۔ مگر پونم اسے حسین لگا۔ اسے احساس تھا کہ وہ پونم ہے۔ وہ اپنی طاقت سے کب کی آگاہ تھی جب عورتیں مڑ کر دیکھتیں ہائے کتنی پیاری بچی ہے۔

یونس بے چینی سے راہ دیکھ رہا تھا۔ رفیق پونم کو لینے گیا تھا۔ گھر اترنے کی بجائے وہ مارکیٹ میں اتری تھی جسکے پچھلے دروازے سے گھر چلی گئی تھی اور آج بھی مارکیٹ سے ہی آنا تھا۔ رکشے سے اچانک کار میں آنا جانا سوالوں کی راہ ہموار کرتا۔ یونس اس کے لیے خصوصی طور پہ تیار ہوا تھا۔ عمر گھٹانے کے سارے حربے رفیق اور آصف نے اسکے چہرے پہ آزماء ▯ ڈالے تھے۔ ماسک تو وہ بہت دنوں سے لگا رہا تھا۔ جانے کیوں پونم گذشتہ روز سے بھی زیادہ حسین لگی یا شاید اس لیے کہ اب اپنی اپنی سی تھی۔ یونس نے اسے Synopsis کے علاوہ سوالوں کی ایک فہرست بھی تیار کر دی تھی۔ پونم کھل اٹھی۔'' ان سوالوں کے جواب تم سے بہتر کون دے سکتا ہے۔ پلیز ان کے جواب بھی لکھ دو'' یونس کے چہرے پہ سپیرہ راغد اتر آیا۔'' میں تو روز ملنا چاہتا ہوں پونم۔ ہر روز تم سوال کرو گی میں جواب دیتا رہوں گا تم مجھے اماوشیا میں چھوڑنا چاہتی ہو؟'' پونم کے جواب نے یونس کی خوشیاں لوٹا دیں'' میں ہر روز آؤں گی، مگر سب کچھ تم لکھو گے۔ وعدہ کرو'' پونم کا ہاتھ تھامے ہی زندگی کے میکدے سے جوانی لوٹ آئی۔ گفتگو کرتے ہوئے بھی یونس وقت کی بلائیڈ مختصر کرنا چاہتا تھا۔

وہ فلاش کے کارڈز اٹھانا چاہتا تھا۔

''کل اتوار ہے، میرے ساتھ چلو گی لانگ ڈرائیو؟'' پونم بھی تیار تھی'' ہاں بولان چلتے ہیں۔ کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے'' پھر وہی آلٹو کا ڈرامہ ہوا رفیق جا کر لے آیا۔ بولان پہ شب عاشور طاری تھی۔ شمر تلوار لہراتا پھرتا تھا۔ کتنے ہی قتل، مسخ شدہ لاشیں، جبری اغواء ▯ بولان دم سادھے دیکھ رہا تھا۔ یونس چیک پوسٹوں کو قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرتا یہودی تو ان کے ساتھ کھانا بھی نہ کھاتے۔ یونس کے سن گلاسز کے باوجود پونم اس کے تاثرات پڑھ رہی تھی۔'' تم تو war Anti ادیبوں کی صف میں آتے ہو ہیمنگوے خود تو جنگ میں شامل ہوا۔ مگر میں اسے انٹی وار سمجھتی ہوں'' یونس ابل پڑا'' چند لوگوں کی خواہش اقتدار کے لیے ہزاروں لاکھوں لوگ سر کٹاتے اپاہج ہو جاتے چلے آئے ہیں۔ شجاعت سے قتل کرنے قتل ہونے والوں کو لوہے کے ٹکڑوں سے نوازا جاتا ہے۔ جنہیں تمغے کہتے ہیں۔ War is never sacred وار عظیم بھی نہیں ہوتی دوسری جنگ عظیم کی بجائے دوسری عالمی جنگ کہا کرو

Peace is the virtue of civilization war crimeitsis ویسے یہ وکٹر ہیگو کا فقرہ ہے'' اس کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ بس چلتا تو سپاہیوں کو کچل کر نکل جاتا۔

پونم نے اسکی کلائی تھام لی کیونکہ ہاتھوں میں ڈرائیونگ گلوز تھے۔ گیارہ ہزار واٹ کا کرنٹ نہ لگتا۔

''تم میوزک تو لگاؤ''

جلتا ہوا سورج اوماڑہ، گوادر کے سمندر میں اترنے کو بھاگا جا رہا تھا۔

''کولپور کا مندر دیکھو گی؟''

''کول پور قدیم تہذیب کا مرکز بھی ہے۔ خڑلا کی کوتل۔ کوٹ درجہ اور جانے کیا کیا اس کے نام رہے''

پونم بے یقینی سے یونس کو دیکھتی رہی۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ ان پہاڑوں میں مندر بھی رہا ہوگا''

مگر قدیم مندر کو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ بچگانہ استعجاب سے وہ مندر میں گھومتی پھرتی دیکھتی رہی۔ متھرا کے کسی مندر کی وہ خود بھی حسین داسی لگ رہی تھی۔ جس کے ہاتھ بھگوان نے مہادیو کے مندروں کے دیپ جلانے کے لیے بنائے ہوں۔

پونم اس کی زندگی میں شامل ہوئی جاتی تھی ڈرائینگ روم سے سٹڈی اور بیڈروم کا فاصلہ ہفتہ بھر میں طے ہو گیا۔

پونم عید پہ گھر بلانے میں متذبذب تھی۔ لیکن یہ ضروری بھی تھا۔ تاکہ بابا اور ماں سے مل لے وہ اپنا امیر داماد دیکھنا چاہتے تھے۔ پونم نے سختی سے منع کیا تھا کہ غربت گزری زندگی کے بارے میں یونس سے کچھ نہیں کہا جائے۔ پونم نے بتلا رکھا تھا کہ ان کا عام سا فلیٹ ہے اور کسی چھوٹی کار میں عید ملنے آئے ورنہ تو ان گلیوں میں مڑ بھی نہ سکے گی۔ پڑوسی بھی متوجہ ہو جائیں گے۔ عید کا نیلا سوٹ یونس نے بنوا کے دیا تھا۔ جس پہ طلائی کشیدہ کاری تھی۔ پونم سوٹ دیکھ کر جھوم اٹھی تھی۔ اس کے دل میں یونس کی مارکیٹ بڑھ گئی۔ حالانکہ یونس بارہا کہہ چکا تھا کہ وہ محبت تو کرتا ہے مگر شادی نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ ساری فیملی اسے چھوڑ دے گی۔ بدنامی بھی ہوگی کہ اس عمر میں شادی کر ڈالی۔

یونس اپنے دو ملازمین کے ساتھ آیا۔ جو فلیٹ تک پہنچا کر گاڑی کے ساتھ چپک رہے تھے۔ گدیلے اور بالشت تھے سلیقہ تھا مگر فرنیچر نہیں تھا۔ گھٹنے کی تکلیف کے باوجود وہ مسکراتا ہوا گدیلے پہ بیٹھ گیا۔ حال احوال کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ پونم چائے بنانے چلی گئی تھی۔ یونس کے پاس موضوع نہ تھا۔

''آجکل بڑی گرمی ہے'' اس نے بات چھیڑی۔ اللہ داد مسکرایا۔

''ساب گرمی آپ نے کہاں دیکھی ہے۔ گرمی تو سبی کی ہوتی ہے۔ ہم گرمیوں میں کولپور آجایا کرتے میرے عزیز ریلوے کا کوارٹر دے دیا کرتے''

یونس کے ذہن میں پھلجڑیاں سے چھوٹ گئیں۔ ''مومل کو کیسا لگتا تھا'' اللہ داد نے دیرینہ کی ''اسے اچھا لگتا۔ دن بھر مندر میں ہندو لڑکیوں کے ساتھ رہتی بلکہ ان کے ساتھ مل کر یاتریوں کے لیے چائے بھی بناتی۔ بھجن میں بھی آواز ملاتی۔ ساتھ ہی مل کر بھجن گاتی''

عید کے روز یونس کو دیکھ کر ڈاکٹر عرفان بہت خوش ہوا۔ یوں تو دونوں ہی بچپن کے دوست تھے۔ ڈاکٹر عرفان دین و دنیا نبھاتا جبکہ اینٹی ہیرو ناولز لکھنے سے قبل ہی یونس اینٹی ہیرو، دل پھینک خیمہ عمر خیام میں جا بیٹھا۔ کالج کے دور میں ہی رہ حافظ و خیام پہ چل نکلا۔ عید کے تین روز راجہ اندر کے اکھاڑے میں جھولنے والا آج عید ملنے آیا تھا۔ عرفان بہت خوش ہوا۔ عرفان یوں تو سمجھا تا رہتا مگر یونس نے ہمیشہ سنی ان سنی کی۔

''یہ جو Venereal Disease میں ان سے بڑے بڑے ادیب مارے گئے۔ ٹالسٹائی، نطشے، جان کیٹس، دوستو وسکی، لینن، آسکر وائلڈ، واجد علی شاہ، نزرالاسلام قاضی اور ہمارا پسندیدہ افسانہ نگار موپساں جسکا تم اتباع کرتے ہو۔ بتالیس برس کی عمر میں اذیت ناک موت مرا۔ گلا کاٹ کر مرنے کی کوشش بھی کی اس نے تین سو شاہکار افسانے لکھے ورنہ سوچو کیا کچھ لکھتا۔ واجد علی شاہ کیسے تڑپ تڑپ کے مرا''

یونس کچھ پرواہ نہ کرتا ''سارے مسائل کا ایک ہی حل۔ بستر اٹھا تبلیغ پہ چل۔ یار بائرن چھتیس برس شیلے کرسٹوفر مارلو دونوں انتیس برس جی سکے۔ اب تم مجھے شب جمعہ صدیقیہ مسجد جانے پر مجبور نہ کرو۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے''

عرفان دل برداشتہ ہوئے بغیر ہی سمجھاتا رہتا۔ پھر چائے کا دور چلا۔ یونس نے مندر کی کہانی سنائی کہ کتنی شاطر چالباز لڑکی ہے۔ وہ تو پونم کو ایک معصوم سی بھولی بھالی انیلی سی سٹوڈینٹ سمجھتا تھا۔ عرفان بالکل حیران نہ ہوا ''نئی نسل ماڈرن ترقی یافتہ دماغ اور سماجی رویوں کے ساتھ آتی ہے۔ ہم تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے جیسے ہم ان کی جدید مشینیں آپریٹ نہیں کر سکتے۔ توبہ کرو۔ توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوتا ہے۔ کنارہ کشی کرو''

ڈاکٹر عرفان ایک کامیاب پیتھالوجسٹ تھا۔ بی ایم سی میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی رہا۔ غیر ملکی ڈگریوں اور جدید مشینوں کے باعث اسکا پرائیویٹ کلینک بھی خوب چلتا۔ یونس کے لیے عرفان کا مشورہ قابل قبول نہ تھا۔ ایک کم عمر سٹوڈنٹ۔ غریب سی۔ نہ قوم نہ قبیلہ اسکا کیا کریلتی۔ شائد پونم تفریحاً جھوٹ بولتی ہو ورنہ اس سے ذاتی طور پہ اسے کیا فائدہ ہوتا۔

روزانہ ملنا جاری رہا۔ چند ہی روز بعد اسے موبائل پہ پونم نے بلایا۔ بے حد نروس اور الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''اسی وقت چلے آؤ اگر مجھ سے محبت ہے۔ میری زندگی چاہتے ہو'' اس سے پہلے کہ یونس جواب دیتا ہچکیوں سسکیوں میں فون بند ہو گیا۔ رفیق کار دوڑائے جا رہا تھا پھر بھی یونس ڈانٹ رہا تھا کہ تیز چلو دروازے سے ہی پونم اسے اپنے کمرے میں کھینچ کر لے گئی۔ اور ڈاکٹر عرفان کے کلینک کا لفافہ تھما دیا۔ یونس نے حیران ہو کر لفافہ چاک کیا Report Pregnancy تھی اوپر پونم کا نام لکھا تھا درمیان میں بڑا سا Positive تھا۔ نیچے ڈاکٹر عرفان کے دستخط تھے۔ یونس چکرا کر گدیلے پہ ڈھیر ہو گیا۔ اس سے تو بہتر ہوتا اس کی گولی یا کار کی ٹکر سے کوئی مارا جاتا۔ بے عزتی تو نہ ہوتی۔ پونم نے سسکیاں لیتے ہوئے نکاح نامہ سامنے رکھ دیا۔ نتائج سے خوفزدہ ہو کر اس نے ڈاکٹر فاسٹس کی طرح اپنے خون سے دستخط کر دیئے۔

پونم نے نکاح نامہ کے ساتھ اسے بیٹھک میں دھکیل دیا۔ جہاں مولوی اور پونم کے گھرانے کے چند مرد بیٹھے تھے۔ پونم کا اصرار تھا کہ شریعت کے مطابق دعوت دی جائے تاکہ نکاح کا اعلان ہو۔ اگلے ہی روز گھر پہ کھانے کا اہتمام پونم کی نگرانی میں ہوا۔ ڈاکٹر عرفان کھانے پہ پہنچا تو سخت حواس باختہ تھا۔

''یہ اچانک کیا ہو گیا'' وہ دونوں لان کے نسبتاً تاریک گوشے میں بیٹھے تھے۔ یونس نے بجائے جواب دینے کے عرفان کے کلینک کی رپورٹ کھول کر میز پر رکھ دی ''اس کے ہوتے ہوئے یہی ایک آپشن بچا تھا'' ڈاکٹر عرفان اچھل پڑا ''یہ دستخط میرے نہیں ہیں'' یونس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پونم کھانے کے لیے بلانے آئی تھی کیونکہ میز لگ چکی تھی مہمان انہی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی بحث و تکرار اور ان کی بدحواسی پہ مسکرائی دی۔

''آپ پریشان نہ ہو میں عبائیہ پہن کر یونس کی بیوی بن کر آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے کلینک گئی تھی سٹاف نے یونس کے نام پر احترام کیا۔ بجائے عام مریضوں کے آپ کے دفتر میں بٹھایا۔ کولڈ رنک بھی پیش کی۔ موقعہ پاتے ہی میں خالی فارم لے کر نکل گئی۔ اسے ٹائپ کیا اور آپ کے جعلی دستخط کر دیئے۔ چلیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔

وھاو

مہتاب جکھرانی

آنہی ءِ لاغریں بت لافا گُش ئےِ کہ مزائیں طاقتے آختغ اث۔ آنہی آ یہ سٹّ آ گوں دست پاذاں جتغیں نیل کڑی بھورینتغ انت۔ کڑیانی بھورینغا پذا ایشی آ یہ ساعتے ہمیشانی نیغا دیشہ۔ کمیں چُپّی آ دیثو یہ بشکند غے داث ئی۔ چیاریں پلواں گندغا پذ ایشی آ نیل و کڑی دست پھُرّا لوڑ داثغ انت۔ رُمبانا رُمبانا کمیں دیما شثو جکشہ۔۔۔ کمیں سوچثو پذا اگڑتہ۔ ہماں پرینتغیں نیل کڑی زڑتغ انت ئی۔

نیل کڑی کوفغا لڑک کثوا ے نی پدیئغ اث۔ کسانی آ پذا اے اولی دھک اث کہ پدیئغ اث۔ ایشی آ وثی کسانی گیر کثغ اث کہ چوں سنگتاں گوں بھیٹ کث اثیں۔ نی پدیئانا پدیئانا باغے آ سر بیثغ اث۔ ایشی آ وثی رَندا کپتغیں شاڑتہ شموشتغ اشنت۔ پاذاں پاشواذی آ دائیں باغ لافا ٹِہنگاں دیانا ماروغ اث۔ ہڑ چی باغ لافا روانا روغ اث، باغ ایشی آ وڑاناں روغ اث۔ چی ءِ دیر بزیں گُلانی وٹا وڑوڑیں پِرّ کانی جھارے درینے ءِ پاراں دیئغ اث۔ پِرّ کانی گندغا پذا ایشی آ راوثی کسانی ءِ سنگت اَرِیّو وشہدران یادآ ختغ انت۔ " کیئزاں مرشی اَرِیّو وشہدران ایذا بیاختین انت تہ ماپِرّک گپتیناں۔۔۔!" اے ٹوٗ کا پذ ایشی آ راتی خیالے آ بیڑ ثہ، کمیں مونجھا بیثہ۔۔۔"اِنا۔۔۔! من پچے کسے آزاتی آ پُلاں؟ بلاں پرک بال کنت۔۔۔ زیندءِ چسّاں زیرنت۔"

ایشی آ اغدِہ تشغ و ٹِہنگانی دیئغ شروع کثہ۔ گُش ئےِ کہ آزاتی آ ایشی آ یہ نوخیں زیندغی ءِ داثغ اث۔۔۔ ٹِہنگاں دیانا روغیں کندانا۔۔۔" ہا! آزاتی ہمیش ایں۔۔۔ مئے زیند۔۔۔ مئے دستا۔۔۔!" نی ٹِہنگاں گوں اواری آ گوں وث آ ٹوٗ کاں دِہ کنانا روغ اث۔ دستاں مرگانی بانزلانی ڈولا جھل بڑز کنغ اث، گُش ئےِ چومر گے ڈولا بال آ ایں۔

اغدِہ پِرّ کی جھارے دیث ئی۔۔۔ کندانا کندانا گواں جث ئی۔۔۔ "بیا ایت پرکاں۔۔۔! زیندو آزاتی ءِ وش و ساڑتیں ساعتاں لوچوں۔۔۔ "اے ٹِہنگاں دیانا پِرّ کاں شہ گُستہ۔۔۔ پرکاں ایشی پلوا دلگوش نہ داشہ، آں وثی زیند ءِ وشیں ساعتاں ماڑغ اشنت۔ کس ایشی گوا نکا نیاختہ۔ ایدیما روانا دائیں پذا گندغ اث کہ نواں کسے آنہی گوانک آ بئیث۔ پذا گنداناں ایدیما روغ اث کہ ٹھابُڑثو کپتہ۔

ٹھابڑغا پذ کوفغ آ لڑکیں نیل و کڑی گڑدن، پاذ و دستاں مان آختغ انت۔ خیال کث ئی تہ دیث ئی ہماں کہنیں کوٹھی و گنوخیں سنگتا گوں بھوتار ءِ قید خانہ آ بستی ایں۔ ایشی سنگت آ دیثو پول کثہ۔۔۔ "تئہ بےسُریں مڑدے ئےِ مگر ہر کذیں تئہ وھاو روئےِ۔۔۔ من گنداں تئہ بشکند غاں دیئےِ۔۔۔ کندئےِ، تئ دیم جوان مان کئیث، گُش ئےِ تئہ خوش ئےِ۔۔۔! ہمیشی ءِ چے سوب ایں؟" آنہی ٹوٗ ک ایشی آ وش نیاختہ۔ جھٹے آ چپ کثو گُشت ئی "من آزاتی وھاواں گندغاں۔۔۔! زِیث روشے کئیث واژہ مئیں فرمانبرداری آ شہ خوش بیث، مناں آزات کنت۔ تئ رِگر و اڑیانی سوباشہ ہڈ ہمیذا گل انت۔

ایشی ٹوٗ ک کنغ رندا گنوخ چی ءِ خیال آ کپتہ۔۔۔ کمیں سوچثو گُشت ئی " آزاتی وھاواں گوں دست نئیث۔۔۔! ہاغہہ بی اگر آزات بیئغ لوٹ ئےِ۔۔۔ آزاتی حقیقتے۔۔۔ وھاوے نئیں۔۔۔ اے قربانی لوٹی۔۔۔!" ایشی ٹوٗ ک پیلو بیئغ آ شہ پیشا آنہی آ زہر کثو گُشتہ "مئیں وھاو دروغیں وھاو نہ انت۔۔۔! اے آزاتی ءِ مستاغری انت۔۔۔ تئہ گنوخے ءِ واژہ ءِ نافرمانی کن ئےِ، تئ نصیو ہمے سیاہیں کوٹویں۔۔۔!" ہڑ دوئیناں یک دوہمی آ ہر روشی ڈول آ گنداں آ دیم دوہمی پلوآ کثغ انت۔

وھاو لافا ہرّ ونوخیں باغے گندغ و ٹِہنگانی دیئغ آ آنہی دل آ را چھروگڑ دءِ یہ حقی ئیں خواہشے پیدا کثغ اث۔ نی نافرمانیں باندی آ گوں ایشی ءِ دل مان نیاخت۔ آنہی آ اگر ٹوٗ کے کثیں دِہ ایشی جواب نہ داث۔

اے صحوءِ وختا وھاوے گندغ اث کہ ایشی مُسک آ لٹّ آ سٹکا اِشتہ۔۔۔ ایشی آ زانتہ کہ اے پک ہمے گنوخ ءِ شِریں کہ مئیں حقی ئیں وھاو آنہی آ راونڑغ آ نہ انت۔۔۔۔۔۔ "مرشی ترا چوبدار دستا پُسکا ءِ دیائناں۔۔۔ گاریں لغور! " مُسک آ گھرڑاناں دیث ئی تہ چوبدار جندایں۔ " تئ سنگت تام ایں۔۔۔؟ " چوبدارا بڑزیں توارا گوں پول کثہ۔ ایشی آ اِنگو آنگو دیشہ تہ کوٹھی آ را گڑکے اث۔ زانت ئی گنوخ تختو شثہ۔ ہمے ساعتا واژہ گوں شاڑتہ آں پجثہ۔ ایشی آ دلا زانتہ " مرشی ایشی آ را فرمانبرداری ءِ انعام وتختغیں قیدی آ را گرغ آ پذا سزا اِملیث۔"

"تئہ ! وھاو لاف آ پچے کندغ اث ئےِ؟" چوبدارا پول کثہ۔۔۔ ایشی آ دستاں بنداں آ گُشتہ " بھوتار! من وھاوے گندغ اثاں۔۔۔" "چونیں وھاوے" واژہ آ پول کثہ۔" واژہ چی ءِ روش بیثہ من آزاتی ءِ وھاواں گندغاں!" قیدی آ جواب داشہ۔

"ایشی آ ٹنگ ایت کہ برّیں وھاواں گندغ ایں۔۔۔!" واژہ آ حکم داثو بھیڑ ثہ۔

زمیں جنبد

سلمیٰ جیلانی

یہ کہانی ہے گل محمد کی جو چاغی کی پہاڑیوں کے دامن میں اپنی بیوی مینا اور چالیس بکریوں کے ساتھ برسوں سے ایک ہی طرح کی زندگی جی رہا ہے۔ روزانہ صبح سویرے اٹھ کر اپنی بھیڑ بکریوں کے ساتھ اپنے پڑوسیوں اور جاننے والوں کے مویشی بھی اکھٹا کرتا ہے اور پہاڑی کے دوسری طرف ایک کھلے میدان کا رخ کرتا ہے جہاں برائے نام ہی گھاس رہ گئی ہے مگر اس کے لئے وہاں جانا ہی اس کی روزی کا واحد ذریعہ ہے۔

اسے گزشتہ کئی ماہ سے کھانسی کی شکایت ہے۔ اکثر رات کو بخار بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی دیکھ بھال کی طرف سے غافل رہتا ہے۔ حالانکہ آج تو کھانسی کا دورہ خاصا شدید تھا اور قریبی جھاڑیوں میں بلغم تھوکتے ہوئے اس نے اپنے تھوک میں خون کی آمیزش بھی دیکھی۔ ایک لمحے کو چونک سا گیا پھر فوراً ہی اسے معمول کی بات سمجھ کر نظر انداز کر کے بکریوں کے پیچھے چل پڑا جو گھاس کی تلاش میں کافی دور نکل گئی تھیں۔

شام ہو چلی تھی گھر کی طرف پلٹتے ہوئے گل محمد اپنے ذہن میں پیر صاحب کے ڈیرے کی طرف جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ضرور کسی پہاڑی بدروح کا سایہ اسے تکلیف میں مبتلا کر رہا ہے۔ صدیوں اس کے آباؤ اجداد مسلمان ہونے کے باوجود اسی عقیدے پر کاربند تھے۔ گل محمد تو اپنے ساتھ اپنی بھیڑوں تک کے لئے پیر صاحب سے تعویز لاتا تھا اور عجیب بات ہے کہ وہ تعویز پی کر ٹھیک بھی ہو جاتیں لیکن گل محمد کی بیوی مینا اس کی ان باتوں کو توہم پرستی قرار دیتی اور اپنے لئے چھپ چھپا کر علاقے کی کریانہ کے دکاندار کی بیوی سے کہہ کر پینا ڈول منگوا لیتی مگر گل محمد سے بات کرنا تو ایسا ہی تھا جیسے کسی بھیڑ سے بات کر رہی ہو لیکن رات کو گل محمد کو مسلسل کھانستے دیکھ کر اسے فکر سی ہوئی

مینا: گل محمد میں دیکھ رہی ہوں تمہاری کھانسی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے شہر کے ہسپتال جاؤ اور کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ

کئی سال پہلے میری چاچی کو بھی ایسے ہی کھانسی ہوئی تھی تو شہر کے ہسپتال سے ٹھیک ہو گئی تھی

گل محمد نے اس کی طرف غصے سے دیکھا مگر کھانسی کے دورے نے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا جب کھانسی کا زور کچھ کم ہوا تو مینا کی طرف متوجہ ہوا جو کچے صحن میں بیری کے درخت کے نیچے پڑی چارپائیوں پر رلی بچھا رہی تھی

گل محمد کو مینا پر غصہ کم ہی آتا مگر ڈاکٹر والی بات اسے بری لگی تھی

اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہوئے بولا "اری نیک بخت تو تیس سال سے میرے گھر میں ہے کبھی دیکھا ہے کسی نے بھی کوئی دوا لی ہو یہ سب پہاڑیوں کا آسیب ہے جب ہی تو یہاں کوئی ڈاکٹر بھی کبھی نہیں ٹکا ۔

میں کل ہی پیر صاحب کے ڈیرے پر جاؤں گا اب کی مرتبہ بہت بھاری اثر ہوا ہے جو کھانسی بڑھ رہی ہے

مینا نے گل محمد کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے تکیہ سے بوسیدہ غلاف اتار کر نیا کشیدہ کاری والا غلاف چڑھا رہی تھی جو اس کی کئی دن کی محنت کے بعد مکمل ہوا۔

اچانک اس نے سر اٹھایا اور کچھ سوچ کر بولی

گل محمد تمہارے بچپن کا کوئی دوست آیا تھا نور محمد نام بتا رہا تھا وہ کل پھر آئے گا تم سے ملنا چاہتا ہے

گل محمد سوچ میں پڑ گیا کون نور محمد؟

پھر اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولا "ارے وہ تو بہت سال پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا وہ ہر وقت شہر جانے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ مجھے بھی اکساتا تھا پھر اچانک ہی غائب ہو گیا اور اس کے بعد کوئی خیر خبر نہ ملی آج اتنے سالوں بعد کہاں سے آ گیا

گل محمد کافی پر جوش ہو گیا تھا وہ دیر تک مینا سے اپنے اور نور محمد کے بچپن کے قصے دہراتے جانے کس وقت نیند کی وادی میں چلا گیا

اگلے دن نور محمد اسے دروازے پر ہی مل گیا

دونوں دوست بے تابی سے گلے ملے

کہ دفعتاً ''گل محمد کو پھر سے کھانسی اٹھنے لگی

نور محمد چونک کر تھوڑا فاصلے سے ہو گیا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فکرمندی سے بولا

دیکھو گل محمد ہم دونوں ہم عمر ہیں لیکن تم مجھ سے کتنے بوڑھے دکھائی دے رہے ہو

گل محمد نے ہنس کر جواب دیا" شہر کی آب وہوا تمہیں راس آ گئی ہے اسی لئے تم بجائے بوڑھے ہونے کے جوان ہوتے جا رہے ہو"

نور محمد نے کہا ہاں شہر جا کر میں نے بہت محنت کی کتنی دکانوں اور ہوٹلوں پر کام کیا چائے کے کھوکے سے موٹر مکینک تک کتنے سال لگے لیکن آخر کار اب میری اپنی ورکشاپ ہے اور رہنے کو چھوٹا سے کوارٹر بھی۔

گل محمد اس کی طرف دیکھ کر حسرت سے بولا چلو اچھا ہوا تمہارے ماں باپ تو تمہارے لئے بہت تڑپے مگر تم نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی

نور محمد کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ وہ تنک کر بولا جیسے تم جانتے نہیں۔ بابا کتنا مارتا تھا ماں کی باتوں میں آ کر۔

ہاں یاد ہے وہ کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر سر جھکا کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ریتیلی زمین

کریدنے لگا

کچھ دیر بالکل خاموشی رہی بس بکریوں کے منمنانے کی آواز نے ماحول کو زندگی سے معمور رکھا ہوا تھا

پگڈنڈی کے اونچے نیچے راستے پر آگے بڑھتے دونوں دوست پرانی یادوں میں کھو سے گئے

ابھی وہ چڑھائی کے دوسری طرف نہ پہنچے تھے کہ گل محمد کو کھانسی نے بے حال کر دیا

نور محمد نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا

"بس تم آج ہی میرے ساتھ شہر جا رہے ہو" گل محمد کہتا رہ گیا بہت سے کام ہیں پھر کسی دن میں ضرور تمہارے گھر جاؤں گا لیکن نور محمد نے اس کی ایک نہ سنی اور وہ دونوں دوپہر کو اس کی سیکنڈ ہینڈ ویگن میں شہر کی طرف جا رہے تھے

نور محمد نے ٹی بی ہسپتال میں اس کا سارا چیک کروایا اور کئی ٹیسٹ کے بعد اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ گل محمد کو ٹی بی تھی لیکن ابھی ان مراحل میں تھی کہ مسلسل علاج کے بعد وہ مکمل طور پر صحت مند ہو سکتا تھا- وہیں ایک ہیلتھ وزٹر سے ان کی ملاقات ہوئی جو ان کے علاقے میں ٹی بی کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا۔ گل محمد شہر میں کئی دن گزار کر گاؤں واپس آ گیا اور پھر اپنی سست رفتار زندگی میں مصروف ہو کر دوا دارو سے ایک بار پھر بیگانہ ہو چکا تھا البتہ پیر صاحب کے تعویزوں پر اس کا اندھا اعتقاد اسے باقاعدگی سے ان کے ڈیرے پر لے جاتا۔

مگر دوسری طرف ہیلتھ وزیٹر جو اپنے کام میں دیوانہ وار پوری تندہی سے ٹی بی کے خاتمے کی کوششوں میں لگا تھا۔

پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے گزرتا اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتا ان کے گاؤں آ پہنچا تھا۔ اس نے گاؤں کے سردار اور پنچایت کے سرکردہ افراد سے ملاقات کی ۔ہیلتھ وزیٹر زین بلوچ نے آج تک جرگے سے متعلق جو منفی کہانیاں سنی تھیں ان بزرگوں اور نوجوانوں سے مل کر اس کا یہ تاثر زائل ہو گیا ۔زین بلوچ نے اپنا منصوبہ ان کے سامنے رکھا تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے اس نے اور بھی کئی لوگوں کے تھوک اور بلغم کے سیمپل لے لئے تھے رپورٹ کے مطابق علاقہ میں ٹی بی تیزی سے پھیل رہی تھی جس کے انسداد کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت تھی

گل محمد جیسی سوچ والے مریضوں کو سمجھانا ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو اس علاقے کی صدیوں سے جمی ہوئی پسماندگی کا نتیجہ تھی لیکن زین محمد کو جرگے کے لوگوں کا ساتھ مل گیا تھا سو کافی پر امید و پر عزم تھا۔

مگر یہ کیا گل محمد کسی ڈاکٹر کے کلینک یا زین بلوچ کے بنائے ہوئے کیمپ میں جانے کے بجائے اپنے پیر صاحب کے ڈیرے پر ہی جا پہنچا تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی لوگ تھے جو اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے

کافی دیر گزرنے کے بعد گل محمد ڈیرے سے باہر نکلا اس کے ہاتھ میں تعویزوں کا تھیلا تھا اور ایک اور پیکٹ بھی تھا پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق اسے تعویز کے ساتھ ایک گولی صبح اور شام کھانی تھی اور تعویز کے پانی میں ایک چمچہ کوکڑوا پاوڈر بھی گھول کر پینا تھا

ڈیرے کے باہر زین بلوچ کا کیمپ خالی تھا لیکن وہ کنکھیوں سے گل محمد اور اس کے ساتھیوں کو پیر صاحب کے ڈیرے کی طرف سے آتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تھا ادھر گل محمد بھی حیران تھا اس مرتبہ پیر صاحب کے تعویز معجزاتی طور پر کھانسی کو کنٹرول کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ مگر پیر صاحب نے سختی سے ہدایت کی تھی اگر کوئی بکری بیمار ہو جائے تو یہ پاوڈر اور گولی نہ دے ہاں البتہ تعویز پلا سکتا ہے-

غزل

عابد رضا

شام کا تارا دیکھ کے ہم قسمت کو رونے لگتے تھے
صبح سویرے اٹھ کر پھر سے پتھر ڈھونے لگتے تھے

جنگوں کا موسم آتے ہی جشن منایا جاتا تھا
اور سپاہی خون میں لتھڑے خنجر دھونے لگتے تھے

مالِ غنیمت کی زنبیلوں میں کچھ ایسے وعدے تھے
شام سے پہلے بستی بستی حملے ہونے لگتے تھے

صحرا میں اک سرخ عماری آگے آگے چلتی تھی
دم بھر آنکھ جھپکتی اور ہم رستہ کھونے لگتے تھے

ناقہ بانوں کو جلدی تھی اور ہمیں یہ عادت تھی
جنگل جنگل صحرا صحرا یادیں بونے لگتے تھے

جامِ جم سے انٹرنیٹ تک حیرت جب ایجاد ہوئی
سات سمندر پار کے قصّے جادو ٹونے لگتے تھے

اک سیارے پر اترے جب، ہم کیسے قدآور تھے
اک بستی میں آنکھ کھلی تو بالکل بونے لگتے تھے

پہلے پہل تو شہزادوں کی خاطر مسند بچھتی تھی
پھر کچھ دن میں وہ بھی اِس مٹی میں سونے لگتے تھے

عہد جنوں یا عہد جوانی، جانے کیا بیماری تھی
اُن رستوں پہ کانٹے پتھر نرم بچھونے لگتے تھے

شہر پناہ کے اندر اک جادوگرنی کا افسوں تھا
دشمن خود اپنی آنکھوں میں تیر چبھونے لگتے تھے

عشق کی منزل آتے آتے سارے آہن چشم جواں
اپنے اشکوں سے پریوں کے پاؤں بھگونے لگتے تھے

اندھیر نگری!

عابدہ رحمٰن

صبح کے دھندلکے میں کان ایک کالے دیو کی مانند لگ رہی تھی۔ ہر سُو خاموشی تھی۔فضا میں پھیلی ایک تیز اور ناگوار بُو سے نتھنے جلے جاتے تھے۔

زنگ آلود دروازوں کی چرچراہٹ جب فضا میں گونجتی تو ایک عجیب سا سماں بندھ جاتا۔کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس خاموشی میں ہلچل مچا دیتیں۔عبدالرحیم پاؤں گھسیٹتے ہوئے اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ گھر سے نکلا تو راستے میں شفٹ کے دوسرے مزدور بھی ملتے چلے گئے۔ بوجھل دلوں اور زخمی روحوں کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ان سب کے چہرے ایک جیسے اور ان کی آنکھوں میں گزرے ماہ و سال کی تکلیف اور جدوجہد یکساں تھی۔

عبدالرحیم جو قد کاٹھ میں لمبا چوڑا، چالیس سے پینتالیس کے بیچ خوبصورت پٹھان تھا۔ رنگ کبھی گورا رہا ہوگا لیکن زندگی کے تپتے ماہ وسال میں سانولا ہو چلا تھا۔ اس کے چہرے کی تھکاوٹ، پریشانی، حادثات کا مستقل خوف اور ماتھے کی لکیریں گئے سالوں کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔عبداللہ اس سے چند سال چھوٹا بھائی تھا جو کوئی سال بھر پہلے بھائی کے پاس آیا تھا۔

دونوں بھائیوں میں کافی فرق تھا۔رحیم تکلیف سہتا تھا۔ درد کو گزارتا تھا، اپنی روح پر اپنے جسم پر۔درد اس کے انگ انگ کو شل کیے رکھتا۔خاموش رہ کر اس کا درد ایک زخم بن جایا کرتا۔ روح ایک گندے پھوڑے کی مانند بہتی رہتی لیکن وہ خاموش رہتا جبکہ عبداللہ کے لیے تکلیف سہنا محال تھا۔وہ چیخ اٹھتا تھا۔بھڑ جاتا تھا۔کئی بار اس کی منہ ماری ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ ساتھی مزدوروں کے ساتھ ایک آدھ بار ہاتھا پائی بھی ہو چکی تھی۔

کوئلے سے سیاہ ہوئے کپڑے جو کئی بار دھلنے سے اکڑ گئے تھے، پہنے تمام مزدوروں نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے نئی شفٹ کا آغاز کیا۔

ہیڈ لائٹس سے کان کی دیواروں پر عجیب ٹیڑھے میڑھے سائے ناچ رہے تھے۔ٹھیک سات بجے کدالوں کی ٹھک ٹھک شروع ہوئی۔ ٹرالیاں ٹنل میں سے چیختے ہوئے گزرنے لگیں۔دوپہر تک خاموشی میں بس ٹھک ٹھک کی آواز آتی رہی۔ایک عجیب سی پُراسراریت تھی۔ دن کا نصف گزرا تو ایک نیم تاریک سے گوشے میں سب آ جمع ہوئے جہاں اوپر سے ٹرالی میں آئی روٹی چائے کے ساتھ کھانے لگے۔کوئی پندرہ بیس منٹ بعد درد یلے جسموں کے ساتھ واپس اپنا کام شروع کر دیا۔

''میں یہ کام مزید نہیں کر سکتا لالا'' چند لمحے ہی گزرے تھے کہ عبداللہ نے کوئلہ کاٹتے کاٹتے کدال دور جا پھینکی۔ رحیم کے ساتھ باقی مزدوروں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ ہیڈ لائٹس دیواروں پر عجیب عجیب ہیولے بنا رہی تھیں۔کوئی فرق نہیں تھا مزدوروں اور ان سایوں میں۔

رحیم نے کدال وہیں رکھی اور ہاتھ زمین پر رکھتے ہوئے جب اٹھا تو زخمی ہاتھ میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔

''کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے عبداللہ؟'' اس نے عبداللہ کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی، کہیں بھی۔''

''ہمارا رزق ان اندھیروں میں پھینک دیا گیا ہے اور اللہ نے ہمیں اس کی تلاش میں لگا دیا ہے کہ جاؤ اپنا رزق تلاش کرو'' رحیم بے بسی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''لیکن میں یہ نہیں کروں گا۔میں یہاں سے نکلوں گا'' وہ چیخا۔ رحیم کے سمجھانے پر وہ بے دلی سے پھر سے کام کرنے لگا لیکن ایسا اٹیک اس پر ہر کچھ دن بعد ہوتا رہتا۔

☆☆☆

چھوٹا سا کچا گھر جس کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ تنگ سا کمرہ کوئلے کی کان سے کم نہ تھا۔ بارش جب ہوتی تو رحیم کی بیوی بخت تاج کمرے میں بالٹیاں اور لوٹے رکھ کر اس کوٹھڑی نما کمرے کو بچانے کی ناکام کوشش کرتی لیکن کمرہ پھر بھی بارش کے پانی سے بھر جایا کرتا۔ زنگ آلود دروازہ جو صرف ایک قبضے سے جڑا جھول رہا تھا۔ دیواروں پر اپنے جنم کے بعد سے شاید دوبارہ کبھی پینٹ نہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔چھوٹی سی تنگ کھڑکی جس سے نہ مناسب ہوا اور روشنی کا گزر ممکن تھا، نہ ٹھنڈ میں کمرہ گرم رکھنے میں مددگار ہوتی۔نمی، دکھ، افلاس اور بے چارگی کی ایک ناگوار بُو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔

ننگے فرش پر لیٹا عبدالرحیم سوچوں میں چھت کو تک رہا تھا جہاں لگے شہتیروں کو نہ جانے کتنی بار گن چکا تھا۔ دن بھر مشقت والی مزدوری کر کے لیٹا تھا۔ بدن کا شدید درد تھا یا کیا جو نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ پاس ادھ ننگے اپنے بے سدھ سوئے بچوں پر جو نظر پڑی تو لبوں پر اک تلخ سی مسکراہٹ آئی۔

بخت نے دائیں جانب کروٹ لی۔''سو جاؤ رحیمے سو جاؤ۔'' کہتے ہوئے واپس نیند کی وادیوں میں کھو گئی اور اس نے بھی ایک لمبی آہ بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

عبداللہ ٹرالی پر لیٹے کوئلے کی کان کے اندھیروں میں اتر رہا تھا۔اسے لگا وہ لحد میں اتر رہا ہے۔''لیکن لحد بھی تو چھ فٹ سے زیادہ گہری نہیں ہوتی..... ایک نہ ختم ہونے والا اندھیرا ..... ایک ناتمام گہری اندھیری لمبی سرنگ'' اس نے ایک جھرجھری لی اور جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔زمین سے ہزاروں فٹ نیچے لوہے، بارودی مواد، کوئلے کی دھول، پسینے اور جانے کس کس کی بُو فضا کو بھاری کر رہی تھی۔ چٹانوں سے کوئلہ توڑنے کی آوازیں بازگشت کی صورت سنائی دے رہی تھیں۔

اچانک ایک زوردار گڑگڑاہٹ سے زمین لرز اٹھی۔ روشنیاں ٹمٹمائیں..... اور بجھ گئیں۔الارمنگ بیل کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ مزدور چیخنے لگے۔ ایک دھماکے سے سرنگ کی چھت گر گئی۔ بے شمار مزدور ملبے تلے دب گئے۔ایک خوف و ہراس پھیل گیا۔ بچ جانے

والے مزدور وہاں سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ فضا دھول مٹی سے اٹ گئی۔ نہ کچھ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی۔ عبداللہ کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔

''لالالالا'' وہ بھائی کو پکارتے پاگل پن سے ملبہ کھودنے لگا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ چیخ چیخ کر رحیم کو آوازیں دے رہا تھا لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور بہرہ کر دینے والی خاموشی.....!

''عبداللہ عبداللہ'' کسی کونے سے آواز آئی۔

''کہاں ہو لالا؟'' عبداللہ زور سے چیخا۔

''شہتیر ..... شہتیر کے نیچے۔''

اور عبداللہ جھکے جھکے ملبے کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے آواز کا پیچھا کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

اگلا دن بہت بوجھل تھا۔ رحیم کی ٹانگ شہتیر کے نیچے غلط زاویے میں دب جانے سے بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ نو کان کن دب کر فوت ہو چکے تھے۔ فضا درد، تکلیف اور ماتم سے سوگوار تھی۔ سورج کی ماتمی شعاعیں سارے میں پھیلی ہوئی تھیں اور کوئلے کی کان کے لبوں پر ایک شاطر مسکراہٹ تھی۔

''نو گھر اجڑ گئے لالا .....'' عبداللہ زنگ آلود کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ اس کے دل سے جیسے ہوک سی اٹھی۔ ''کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔'' اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''قبر کی اس مزدوری میں ہم کچھ نہیں کر پائیں گے ..... مجھے گھٹن ہوتی ہے یہاں ..... میری سانس رکنے لگتی ہے.....!'' عبداللہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور عبدالرحیم کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیا جواب دے۔

چند دن ایک عجیب سی اداسی تھی۔ پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ وہی اندھیر نگری..... وہی روز و شب.....!

مزدور خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ فضا میں بس کدالوں کی ٹھک ٹھک، ٹرالیوں کے آنے جانے کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی کسی مزدور کی آواز آ جایا کرتی۔ عبداللہ بھی سوچوں میں گم کام میں مصروف تھا۔ اچانک باہر سے آتی روشنی کی چھوٹی سی کرن کی جانب اس کا دھیان گیا۔ کام چھوڑ کر وہ اس روشنی کو دیکھنے لگا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر مٹھی میں اس روشنی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا ..... اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تیر گئی۔ مٹی کے ذرات اس روشنی میں ناچ رہے تھے۔ جوں ہی وہ مٹھی بند کرتا، روشنی کی وہ کرن اسے واپس برابر کر دیتی۔ اسے اس کھیل میں مزہ آنے لگا اور کتنی دیر وہ یہی کرتا رہا۔

''روشنی کی اس کرن کو پکڑ کر ہم اپنی زندگیاں روشن کر سکتے ہیں عبداللہ'' سجاد جسے آئے دو دن ہی ہوئے تھے، اسے کھیلتے ہوئے کہنے لگا۔ اس سے پہلے کہ ان میں مزید باتیں ہوتیں، اچانک مینیجر کی نظر اس پر پڑی۔ ''اوئے حرام خوروں، کام کرو، باتیں نہیں۔ لگتا ہے فیصلے میں اپنا حصہ نہیں چاہیے۔'' شام کو کام کے اختتام پر دیہاڑی کی تقسیم، جسے فیصلہ کہا جاتا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کرخت آواز میں چیخا۔

☆☆☆

دن اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ عبداللہ کڑھتا رہتا۔ کبھی چیخنے لگتا۔ ہر کچھ دن بعد کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا بہت سے مزدور زخمی ہو جاتے، کئی مر جاتے۔ کچھ دن کے لیے مزدور ڈر جاتے، سہم جاتے لیکن اپنے اپنے بچوں کو یاد کرتے اور پھر زندگی اسی نہج پر چلنے لگتی۔

روشنی اندھیرے کو چیر رہی تھی۔ پَو پھٹ رہی تھی۔ دونوں بھائی اندھیرے کان کی طرف آہستہ آہستہ باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی۔ کوئل کی کُوک ..... بارش ..... بارش کے چند قطرے اس کے چہرے پر آ گرے۔ اس نے چہرہ آسمان کی طرف کر لیا۔ قطرے عبداللہ کے چہرے پر گرتے رہے۔۔۔ بھگوتے رہے۔ بارش، ہوا، پرندوں کی آوازیں ..... اسے لگا کہ جیسے اس کا تعلق ابھی تک باہر کی دنیا سے قائم ہے ..... ایک ربط ہے جو ابھی ٹوٹا نہیں ..... ورنہ تو وہ سمجھ رہا تھا کہ باہر کی دنیا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ..... ہم بس کوئلے کی اس کالک اور کان تک محدود ہیں۔

''لالا یہ بارش ہماری بھی ہے ..... یہ موسم ہمارا بھی ہے'' اس نے عبدالرحیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو رحیم نے اس کی بات سن کر مسکراتے ہوئے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

وہ ٹرالی کو موت کا تختہ کہا کرتا تھا۔ ایک ناگوار زوردار آواز کے ساتھ وہ تختے پر اندر چلتا جا رہا تھا۔ روشنی معدوم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ زندگی سے، نیچر سے جیسے اس کا رشتہ کٹتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں کھول دیں۔ ٹرالی کے ساتھ ساتھ ایک تار اندر کان کی گہرائیوں سے باہر تک چلی جا رہی تھی جسکے آخر میں ایک گھنٹی لگی تھی۔ خطرے کے عالم میں اس رسی کو چار بار زور زور سے کھینچ کر خطرے کی اطلاع دی جاتی۔

زمین کی تہہ میں ایک نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ نیا دن ..... جو کہیں سے بھی نیا نہیں تھا..... وہی گھسا پٹا دن تھا۔ وہی زخم ..... وہی تھکن ..... وہی روح کو زخمی کر دینے والا دن۔ آوازوں کی تیز دھار کان میں گونج رہی تھی۔ قریب ہی ماما سلیمان کھانس رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس پر کھانسی کا دورہ پڑ جاتا۔ ایک لمحے کو رک کر وہ کام چھوڑ دیتا۔ کھانس کھانس کر دوہرا ہو جاتا اور سنبھل کر پھر سے کوئلہ کاٹنے لگتا۔ عبداللہ خاموشی سے کام کر رہا تھا۔

''یار تم خوش ہو یہاں؟'' قریب کھڑے کوئلہ توڑتے ہوئے سجاد نے اس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

''خوش؟'' اس نے حیرت سے قہقہہ لگایا۔

''اندھیرے سے اندھیرے تک ہم قبر کی یہ مزدوری کرتے ہیں جہاں حادثہ ہو جائے تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ دوسروں کی تو انگلی بھی کٹ جائے تو شور مچ جاتا ہے۔ ہمارا بندہ مر جائے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی، اس کے بچے اس کا پورا خاندان مر جاتا ہے۔ کوئی ہمارا پرسانِ حال نہیں۔ جانوروں کی سی اس زندگی میں، میں خوش ہوں؟'' عبداللہ نے کسی قدر سخت لہجے میں جواب دیا۔

''تمھیں پتہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہماری کوئی یونین نہیں۔ ہم ذاتی جھگڑوں کی وجہ سے اکٹھے نہیں ہو پائے۔ ہم یونین بنائیں گے تو اپنی ڈیمانڈز رکھیں گے مینیجر کے سامنے، مالک کے سامنے۔'' سجاد سرگوشی میں بول رہا تھا۔

مینیجر نے انھیں باتیں کر کے چیخ کر منع کیا تو دونوں چپ ہو گئے اور ایک دوسرے سے دور کھسک کر کام

کرنے لگے۔
شام تک کام کرتے ہوئے عبداللہ سجاد کی باتوں کو سوچتا رہا۔ مغرب کے بعد مزدور سطحِ زمین پر نظر آنے لگے۔ عبداللہ غیر مرئی انداز میں سجاد کی طرف بڑھا۔ دونوں باتیں کرتے کرتے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر آئے۔ سورج کی گرم شعاعیں کوئلے کے کان اور وہاں موجود ہر چیز پر پڑ رہی تھیں۔ دور تک پڑا کوئلہ سورج کی ان شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ پسینے میں شرابور مزدوروں کے چہرے کالی دھول سے اٹے ہوئے تھے۔
تھکن سے چور یہ مزدور کان کے پاس کھڑے ٹرکوں کو کوئلے سے لوڈ کر رہے تھے۔ لوڈ ہو جانے والے ٹرکوں کے انجن اک چیخ کی مانند سٹارٹ ہو کر کان سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ بیلچے زمین سے جب رگڑ کھاتے تو ایک عجیب ناگوار آواز پیدا ہو رہی تھی۔
شیر باچا کا بھی ٹرک لوڈ کر رہا تھا۔
''کاکا کام ختم نہیں ہوا کیا ابھی تک؟ طبیعت کا کیا حال ہے؟'' عبداللہ نے سلام کے بعد پوچھا۔
''طبعیت بس گزارا ہے۔ مزدور کا کام کب ختم ہوتا ہے عبداللہ یارا..... بس یہ ٹرک لوڈ کر کے جاتا ہوں۔'' یہ کہتے کہتے شیر کاکا لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا بیٹھ گیا۔
عبداللہ جانے کس کو گالی دیتے ہوئے کاکا کو سہارا دینے لگا۔ شیر کاکا پچھلے کتنے عرصے سے دمے کا مریض تھا۔ کام کرتے کرتے اس کی سانسیں اکھڑ جاتیں۔ حالت اس قدر خراب ہو جاتی کہ جان کے لالے پڑ جاتے۔
کاکا کو سہارا دے کر اس کے گھر تک پہنچا کر اس نے اپنے گھر کی راہ لی۔ جاتے وقت سجاد نے کہا شام کو مسجد میں ملنا اگر چاہو تو۔ وہ جواب دیے بغیر گلی کی طرف مڑ گیا۔ کھلی نالیوں سے گندا پانی ابل ابل کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور بدبو کا راج تھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ادھ ننگے بچے بہتی ناکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ دائیں طرف کی گلی سے اچانک ایک کتا نکل آیا اور شڑاپ شڑاپ کرتا نالی کا پانی پینے لگا۔
روز کا یہ معمول تھا لیکن آج یہ سب دیکھ کر نہ جانے کیوں عبداللہ کو متلی ہوئی۔ عجیب سا گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ ایسا جیسے وہ یہ پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے الٹی روکنے کی کوشش میں گلی کی طرف دوڑ لگا دی۔
اسے ہر چیز سے گھن آ رہی تھی۔
کچھ سوچ کر شام کو عبداللہ مسجد کی طرف چلا گیا۔ نماز ہو چکی تھی۔ اِکا دُکا نمازی جگہ جگہ بیٹھے تھے۔ سجاد بھی برآمدے کے پاس صحن میں بیٹھا تھا۔ وہ چپکے سے جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''تم اس دن کسی یونین کا ذکر کر رہے تھے۔ اگر ہم یونین بنانے میں کامیاب ہو بھی گئے اور مطالبات لے کر مالک کے پاس چلے بھی گئے تو وہ ہماری بات کیوں مانے گا؟ مینیجر ہماری بات کیوں سنے گا؟'' اس نے بیٹھتے ساتھ کہا۔
''کام سلوکر کے..... کام روک کر..... کام چھوڑ کر..... ہم سب ایک سی تکلیف میں ہیں۔ اگر ہم منظم ہو جائیں، ایک آواز بن جائیں تو مالک کو ہماری بات سننی پڑے گی۔ ہم اس کے لیے سونے کی چڑیا ہیں۔ ہم سے ہاتھ دھو بیٹھنے میں اس کی تباہی ہے۔'' سجاد نے اسے سمجھایا۔
☆☆☆
وقت گزرتا رہا۔ وہ اپنے ہم خیال بناتے رہے اور پھر یہ ہوا کہ وہ پانچ بندوں کی ایک کمیٹی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس نے آہستہ آہستہ یونین کی شکل اختیار کر لی۔ انھوں نے مل کر مزدوروں کے مطالبات ترتیب دیے۔
مزدور بہت خوش تھے۔ اُس دن اُن کی پہلی ہڑتال تھی۔ دن چڑھ گیا تھا لیکن کسی مزدور نے کان کا رخ نہیں کیا۔ پچھلے پچیس سالوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ کان کے پرلی جانب سے آوازیں آ رہی تھیں۔ منیجر چلتے چلتے چٹان پر پہنچا۔ پہاڑ کے دامن میں تمام مزدور جمع تھے اور عبداللہ بڑے جوش و خروش سے اپنے مطالبات بتا رہا تھا۔ ''مزدوروں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں جو ساری دنیا میں دیے جاتے ہیں لیکن ہمیں تو مزدور بھی نہیں سمجھا جاتا۔ ہم جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں'' عبداللہ کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔
☆☆☆
ادھیڑ عمر مینیجر اپنے چھوٹے سے بے ترتیب دفتر میں ڈیسک کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف دیوار پر کوئلہ کان اور مزدوروں کی تصویریں لگی تھیں جبکہ بائیں طرف والی دیوار پر مزدوروں کے بچاؤ کے لیے حفاظتی پوائنٹس لکھے تھے۔
کان مالک ہیبت خان کمرے میں تیز تیز قدموں سے واک کر رہا تھا۔ ایک دم رک کر دبی ہوئی آواز میں پریشانی سے چیخا، "مجھے بالکل گوارا نہیں یہ جو مزدور بڑا سمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔"
"آپ مجھ پر چھوڑ دو صاب۔ سب سنبھال لوں گا میں" مینیجر نے بڑے سکون سے اس سے کہا تو مالک جو پھر سے واک کرنے لگا تھا ایک دم سے مڑ کر اسے غور سے دیکھا جیسے جو اس نے کہا اس کی تصدیق چاہ رہا ہو۔
"کیا کر لو گے تم؟" اور پھر یکدم خونخوار لہجے میں کہنے لگا، "مجھے اور کچھ پتہ نہیں بس یونین نہیں بننی چاہیے۔"
"میرے پاس ایسے لوگوں کو ٹھیک کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ تھوڑا سا نقصان ہو گا لیکن بہت کچھ پانے کے لیے تھوڑا بہت کھونا تو پڑتا ہے۔" مینیجر نے شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تو مالک یوں مطمئن ہو گیا جیسے واقعی اسے یقین ہو گیا کہ مینیجر اس فتنے پر قابو پا ہی لے گا۔
☆☆☆
مزدوروں کا منظم ہونا، یونین بننا اور پہلی ہڑتال نے مزدوروں میں ایک جوش خروش پیدا کر دیا۔ ایک نئی امید کے ساتھ انھوں نے دن کا آغاز کیا۔ کوئلہ کھودتے ہوئے ساڑھے تین ہزار فٹ کی گہرائی تک چلے گئے تھے۔ اچانک زمین ہلنا شروع ہوئی۔ دیواروں سے عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ عبداللہ نے تیزی سے رسی چار بار کھینچی۔ گھنٹی کی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی دور تک چلتی چلی گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ رحیم اور بہت سے دوسرے کان کن دب گئے..... ان کی چیخیں ملبے تلے دفن ہو کر خاموش ہو گئیں۔
دھول بیٹھی۔ عبداللہ گھسٹتے ہوئے چیختے خدا جانے کیسے بڑی مشکل سے باہر آیا۔ وہ بس اتنا کہہ سکا ''یہ یونین کو ختم کرنے کی سازش ہے'' اور بے ہوش ہو گیا۔

الارمنگ بَیل کی آواز ابھی تک فضا میں گونج رہی تھی!

چاپ

مصباح نوید

سجے سجائے لشکتے وسیع کمرے میں کسی نہایت قیمتی ایئر فریشنر کی مہک پھیلی رہتی۔سجاوٹی اشیا جگہ بے جگہ پڑی تھیں یوں لگتا تھا کہ جیسے ان قیمتی آرائشی اشیا کو رکھنے ہی کے لیے اس نشست گاہ کو بنایا گیا ہو۔دیواروں پر سنہری فریموں میں کلمے، چاروں قل ،کچھ عربی دعائیں نقش تھیں۔کسی ذی روح کی تصویر کہیں نہ تھی۔اورنگ زیب میاں صاحب ایک صوفے پر ساکت بیٹھا رہتا ،کشادہ پیشانی پر دو تین بل، یونانی ناک کے بانسے پر ایک ج؟ھری، ہونٹوں کے کنارے لٹکے ہوئے، جیسے ابھی بسور کر رو پڑیں گے۔چہلم کو گزرے بھی کئی دن ہو گئے تھے پر اب بھی دن کے وقت تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔خود کاری سے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے اور پھر گود میں گر جاتے تھے۔

میاں صوفہ اینڈ پردہ کلاتھ ہاؤس میں کاروبار بظاہر زوروں پر تھا،کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا ورنہ جب سے بیٹا قتل ہوا اورنگ زیب میاں صاحب نے عملاً دکان مینجر کے سپرد کر دی تھی۔رات کو مینجر گھر آ کر دکان کے معاملات پر بات چیت کر جاتا۔

اورنگ زیب میاں صاحب کے باپ عبدالرحمان کو بادشاہوں کی کہانیاں بہت پسند تھی ،نسیم حجازی کو تو گھونٹ گھونٹ ایسے پیا تھا کہ کئی بار رات خواب میں سفید براق گھوڑے پر سوار کشتوں کے پشتے لگاتا ہوا پلنگ سے گر پڑتا تھا۔ پہلے بیٹے کے تولد ہونے پر سوچتا رہا کہ کس بادشاہ کا نام پر ولی عہد کا نام رکھا جائے بہت سوچ بچار کیبعد قرعہ فال اورنگزیب کے نام کا نکلا۔ فیشن میں تو ترکی فرنیچر اور ترک بادشاہ بھی تھے،اس نے سوچا:"رب خیر کرے پھر سہی۔"

ایک آوارہ لوفر سے ہوا کے جھونکے نے کانوں میں سرگوشی تو کی تھی: "عبدالرحمان! الحذر! الحذر! لیکن شفقت پدری اور بیٹے کا جاہ وجلال دیکھنے کی تمنا نے نظر اندازی کرادی، پھر بھی یہ سرگوشی کنکھجورا بن کر کانوں سے ہوتی ہوئی دماغ میں گھس کر کاٹتی ڈنگ مارتی رہی اور جب میاں عبدالرّحمان فالج سیلا چار چاروں شانے چت اسی پلنگ جا پڑا جہاں کبھی سفید گھوڑے پر سوار کشتوں کے پشتے لگایا کرتا تھا،تو یہ بے غیرت حرامی کنکھجورا پنجابی فلموں کے ولن کی طرح قہقہے لگانا بھی سیکھ گیا تھا، قہقہے بھی چھت پھاڑ، دل چیر۔

اورنگ زیب کو شہزادوں کی کہانیاں پسند تھیں۔ وہ شہزادے جن کے سامنے غلام ہاتھ باندھے قطار در قطار کھڑے رہتے تھے۔وہ سونے چاندی کے نہ سہی، کسی قیمتی ڈنر سیٹ میں تو لازم طعام تناول فرماتے۔وہ شہزادے،جن سے ساری خدائی کیا! خود خدا بھی پوچھتا کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟شہزادے سر ہلا کر تمکنت سے جواب دیتے :

"زرا سوچ کر بتائیں گے"، پر سوچنے کا کام وہ ہمیشہ اپنے مشیروں کے سپرد کر دیتے،ایسی فضول دردسری خود مول نہ لیتے۔اورنگ زیب میاں صاحب تو کتابوں میں درج شہزادوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔ کنیزوں اور غلاموں کو کچھ دیر زیر استعمال رکھ کر آگے دان کر دیتا۔زرا سی بے احتیاطی سے کنیزوں پر زرا فالتو خرچہ بھی ہو جاتا تو کیا! مڈوائف باقاعدہ تنخوہ دار ملازم تھی، کہیں کوئی احتجاج پھوٹا بھی تو سر کوبی کر دی جاتی۔دوستوں کے بیچ بیٹھ کر ٹھٹھا بھی اڑایا جاتا کہ عوام کی اوقات ہی کیا ہے بس قیمے والے نان! ہاہاہا!۔۔۔ شاعر سچ کہتے ہیں کہ انھیں چاند بھی روٹی ہی نظر آتا ہے احسان فراموش! بھکی قوم!!"۔اللہ کے فضل وکرم سے اورنگ زیب میاں صاحب کو بھوکا ہونے کا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔اس کا تو مشغلہ یعنی فیورٹ ہابی ہی ریسٹورنٹ گردی تھی ،مہنگے سے مہنگا ریسٹورنٹ سے لے کر ڈھابوں تک،اورنگ زیب میاں صاحب موجود ہوتا، سلاخوں میں پرویا ہوا انگاروں پر سنکا ہوا گوشت اس کا من پسند کھاجا تھا۔ان تمام دلپشوریوی اور دل لگیوں کے باوجود پژمردگی دل سے جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔سیل فون کے کنٹکٹ لسٹ میں گرل فرینڈز کی طویل فہرست تھی، ہر ایک کو باقاعدگی سے "آئی مس یو کے ساتھ "جانی! اداس بہت ہوں" کے میسج بھی جایا کرتے. پر اداسی کا درماں کسی کے پاس نہ تھا، سبھی آرائشِ گیسو،نوکِ ابرو سنوارنیاور غازہ شازہ لگا کر اپنی اپنی اداسیاں بہلانے میں مصروف تھیں، کوئی اورنگ زیب کی اداسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔"میاں عبدالرحمان کی دوسری اولاد میں یہ چھل بل نہ تھے۔ایسے بھی میاں عبدالرحمان نے بڑے بیٹے کی شہزادگی سے بدک کر چھوٹے دونوں بیٹوں کے ناموں کے ساتھ غلام کا سابقہ لگا دیا تھا اور بیٹی کنیز فاطمہ تو خیر تھی ہی پرائے گھر کی لیکن دو بھائیوں کی شراکت کو برداشت کرنا بھی آسان نہیں تھا۔غلام رسول کو تو پولیو کا حملہ ناکارہ کر گیا وہ تو اپنے جوگا بھی نہ رہا، پہلے ماں اور پھر ایک ملازم مختص رہا جو اسے شکم سیری کرواتا،حوائج ضروریہ سیفراغت میں بھی مدد کرتا۔غلام حیدر کو کتابوں کا چسکا پڑ گیا۔ وہ بڑے بھائی کی گفتہ ناگفتہ سرگرمیوں سے الگ تھلگ کتابوں میں محو ہو گیا۔باپ کی الماری میں پڑی جہادی کتابوں میں تو اس کا جی نہ لگا،کالج میں موجود لائبریری اس کی پناہ گاہ رہی، پھر دوسرے شہر اعلیٰ تعلیم کے لیے گیا تو سالوں بعد پروفیسری کے ساتھ بیوی بچے بھی لے کر پلٹا،اس کی بیوی بھی کالج میں پڑھاتی تھی۔شادی

ماں باپ کی مرضی کے خلاف کی تھی اس لیے واپس تو آ گیا لیکن الگ گھر لے کر رہنا پڑا۔اس محبت کی شادی نے

بوجہ معطل کیے گے اورنگ زیب کی شادی کے سلسلوں کو بھی بحال کر دیا ۔اورنگ نے بھی کالج کی لیکچرار کی فرمائش کی۔ رنگ گورا ،عمر چھوٹی،قد لمبا، دبلی پتلی ، نیک سعادت مند سگھڑ منہ میں زبان نہ رکھتی ہو وغیرہ وغیرہ ایسی ہی کچھ اورخصوصیات بھی ہر آئے گئے کے سامنے گنوائی جاتیں جیسے مال کا آرڈر کسی فیکٹری میں بک کروایا گیا ہو، کمال یہ ہوا کہ ڈیمانڈ کے مطابق لڑکی دستیاب بھی ہو گ ء۔اورنگ زیب بھی ان پڑھ نہ تھا۔ سالوں شہر کے مہنگے ترین پرائیویٹ کالج میں جاتا رہا تھا ، پھر باپ کی لش پش دکان بھی تو اسی کی تھی یا کم از کم اورنگ زیب میاں صاحب ایسا ہی سمجھتا تھا۔ گھر میں رزق کا ڈھیر تھا۔ ایک کیا اگر چاہتا تو چار کالج کی استانیاں بھی حبال؟ عقد میں لاسکتا تھا۔ شادی تو ہو گ ء پر اولادِ نرینہ کی چاہ کچھ سالوں کے بعد ہی پوری ہوئی۔ بیٹےکی پیدائش کی خوشی میں بانٹنے کے لیے لڈو چار مغز، پستہ ،بادام ڈلوا کر تیار کروائے گئے۔اہلیہ ہسٹری کی لیکچرار تھی، بڑے چاؤ سے نومولود کا نام نوشیرواں عادل رکھا گیا۔دیورانی مبارک دینے آئی تو کہنے لگی:"

بھلا بادشاہ بھی کبھی عادل ہوئے!!!!"

اس کے جاتے ہی اہلیہ نے نخوت سے کہا:اونہہ نہ دین نہ ایمان ،اپنے آپ کو زیادہ ہی پڑھی لکھی سمجھتی ہے، جیسے ہم نے ڈگریاں نہیں حاصل کیں ، بھاڑ جھونکا ہے۔، نہ بارات نہ ولیمہ،حیا نہ آئی بچوں سمیت سسرال میں منہ اٹھا کر آتے ہوئے اور پھر ماں باپ کی بددعائیں لے محبت کی شادی کرنے نتائج دیکھو، ایک نہ دو پوری تین بیٹاں لم سَلّمیاں، نہ منہ نہ متھا، نہ تمیز نہ سلیقہ،گلی محلے میں سائیکلیں چلاتی پھرتی ہیں نہ روک نہ ٹوک ، بھلا بیٹیاں پالنے کے یہ طریقے ہوتے ہیں ،ایسے لچھن توبہ استغفار، ہم نے بھی یونیورسٹی پڑھا ہے ،کبھی کسی کو آنکھ بھر کر نہ دیکھا ،کبھی کسی نے بے حجاب نہ دیکھا ،ایسی ہڑبونگ نہ مچائی کبھی۔۔۔۔۔ میرا بیٹا برداشت نہ ہوا، جل گئی ،ابھی لال مرچوں کی دھونی دیتی ہوں۔۔۔

چشمِ بددوووور۔۔۔آنکھوں سے نکال گ ءمیرے لال کو۔"

اورنگ زیب زور سے ہنسا بلکہ ہنستا ہی چلا گیا:"میری ماں چٹی ان پڑھ اور تو ایم اے ، پی ایچ ڈی۔۔۔ ماشاء اللہ!

سبحان اللہ! پرسوچ کا لیول ایک سا،وہ بھی جب بھی میں گھر آتا تو مٹھی بھر لال مرچیں چولھے میں پھینک دیتی،نظر نکالتی ، بیٹاں ماؤں پر جاتی ہےتو تو ہو بہو اپنی ساس پر چلی گ ء،دھواں نہ دے ابھی چھوٹا ہے، مرچوں کی دھونی سہ نہ پائے گا اس کے باپ کی نظر اتار کیسا گھبرو ہے! نطفہ طاقتور ہے نا،نر اولاد ہی نے جنم لینا تھا۔ اہلیہ سے بھول ہو گ ء،اورنگ زیب میاں صاحب کو دھونی نہیں دی گ ء ،شاید اسی لیے نطفے کی طاقت وری دوبارہ کارگر نہ ہوئی، نوشیرواں عادل اکلوتا ہی رہ گیا۔

میاں عبدالرّحمان کو فالج کا اٹیک کمرے تک محدود کر گیا اب خوشحالی، ہوشیاری کاروبار سمیت اورنگ زیب کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ اورنگ زیب میاں صاحب کی ماں خوش قسمت تھی کہ جلد ہی اس موت برابر زندگی سے سبکدوش ہو گ ء البتہ سجے سجائے کمرے میں میاں عبدالرحمان قیدِ تنہائی سالوں بھگتتا رہا تھا۔ وراثت کے جھگڑے تو اس کی اپاہجی ہی میں شروع ہو گئے تھے۔ بہن خود سے نظریں چراتے ہوئے ، نہ چاہتے ہوئے بھی انکار کر گ ء کہ وہ باپ کی جائیداد دوسرے گھر میں نہیں لے جائے گی وہ پیکا گھر کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے گھر کی بھی خوب رہی ،رخصتی پر ہی سنا دیا گیا تھا کہ گھر بسانا عورت کے سر ہوتا ہے بھائیوں کی پگ کا خیال رکھنا۔ دوسرا گھر بھی جلدی سے حلق میں پانی اتارتے ہوئے پیاسے کے اچھو جیسا تھا، اکھوں آکھوں لگائے رکھتا۔اپنے گھر سے یکلخت دست برداری سے دل پر چھائی یاسیت اور پرائے گھر میں اپنی جگہ بنانے کی جدوجہد اسے ہر وقت حالت جنگ میں رکھتیتھے اور پھر ماں باپ کا گھر میں اجنبیوں کی طرح پھوپھی بن کر آنا اور پھر پھوپھیوں پر بنائے گئے لطیفے بھی سننا آسان کام تھوڑی ہے۔ وہ اپنائیت کی چاہ دل میں چھپائے غیریت کے زخم لیے ایک ادھ دن گزار کر واپس سسرال لوٹ جاتی۔ وہ ایک آدھ دن بھی باپ کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہوئے صدی بن جاتا تھا۔"بڑھا ہو گیا اے ابا! تھوڑا کھایا کر۔۔۔چوہڑا بھی تجھے صاف کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہتا ہے: "صاب! بزرگوار ساری رات سینٹری پیڈ میں ہگتا رہتا ہے۔گوہ گوند کی طرح ساتھ چپک جاتا ہے،اتارنا مشکل ہوتا ہے، پھر تنخواہ بڑھاؤ کی رٹ،ادھر میں نے ٹکسال جو لگا رکھی ہے کہ روز تنخواہ بڑھاؤں!۔کھانے کو ذرا کم دو تو شور سارے گھر میں گونجتا:"اورنگ زیبا! تو نے مجھے بھوکا مار دیا۔"۔

سات سال ہو گئے بیڈ پر، کروٹ تک نہیں بدلتی خود سے، پر جینے کا شوق ہے ختم ہونے کو نہیں آتا۔۔۔۔۔ ابا تو مرتا کیوں نہیں؟" جیسے کوڑے شڑاپ شڑاپ لگ رہے ہوں اورنگ زیب میاں صاحب کے لفظ کوڑوں سے کم تو نہیں تھے,وہ اپنی ساری خوش اخلاقی دکان پر خرچ کر آتا ، گھر آ کر باپ سے اصرار شروع ہو جاتا۔"ابا! تو مرتا کیوں نہیں؟"

میاں عبدالرحمان نے پاس کھڑے نوکر سے ملتجی آواز میں کہا:"منہ پر تکیہ رکھ کر سانس روک دے،منت کرتا ہوں تیری۔" نوکر نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو منہ پھیر کر چل دیا۔ خدا خدا کر کے، بالآخر سانس رک ہی گیا۔ پھر نیا لفڑا شروع ہو گیا۔غلام حیدر نے جائیداد

سے حصہ مانگنا شروع کر دیا کہتا کہ دکان میں بھی میرا حصہ ہے۔اورنگ زیب میاں صاحب کی گرج سے کوٹھی کی دیواریں لرزنے لگتیں۔" اباجی کو میں نے سنبھالا، نامراد لولے لنگڑے کی رکھ رکھیل میں کروں اور کاروبار تو سنبھالے واہ جی واہ!۔" روز کی تکرار سے تنگ آ کر ایک دن غلام حیدر خاموشی سے اباجی کے کمرے پر الوداعی نظریں ڈالتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔لیکن خاموشی برقرار نہ رکھی، دعوی دائر کر دیا گیا سمن آنے لگے۔سال گزرتے گئے۔

نوشیرواں عادل نے تیزی سے قد کاٹھ نکالا تھا۔پڑھائی میں بھی اچھا تھا اور منصوبہ سازی کا بھی ماہر تھا۔کالج کے بعد دکان کا بھی چکر لگاتا تھا۔باپ کو کاروبار بڑھانے کے زود اثر نسخے بھی سجھاتا رہتا۔' کہنے لگا:"ایک طریقہ ہے سانپ بھی مر جائے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" اورنگ زیب نے بھنویں سکیڑ کر گھبرو بیٹے کی طرف فخریہ دیکھا۔

"نہ یار! خدانخواستہ۔۔۔۔،" نوشیرواں عادل ہموار آواز میں بولا: "بابا! آپ ٹینشن نہ لیں میں لمحہ لمحہ پلان کروں گا، ایک اعتباری بندہ بھی نظروں میں ہے،ایسے معاملات میں حوصلے بڑے رکھنے پڑتے ہیں ،ماہر نشانہ باز ہے گولی ٹانگوں کو چھوتے ہوئے گزر جائے گی باقی رپورٹ میڈیکل افسر سے لکھوا لیں گے۔اورنگ زیب میاں صاحب کے خدشات لفظوں میں لرز رہے تھے۔"یار دیکھنا۔۔زرا خیال رکھنا، خدانخواستہ۔۔"

اوہ! فادر! ٹینشن نہ لیں جی! دیکھتے جائیں، ہوتا کیا ہے! دیکھتے ہی دیکھتے ٹینشن کیا، آسمان ہی سر پر ٹوٹ پڑا۔

تفتیشی افسر نے وائس میسج سنتے ہوئے اورنگ زیب میاں صاحب کو کہا:"مقتول کی آواز میں ایسا اطمینان اور سرخوشی ہے جیسے قاتل کو نہیں محبوبہ کو دیکھ رہا ہے۔"

نوٹوں کی گڈیاں تفتیشی افسر کی دراز میں تھی اسلیے دبدبہ ہنوز اورنگ زیب کی دکھ سے کپکپاتی آواز میں موجود تھا،" باقی باتیں چھوڑیں جناب ! آپ بیان پر غور کریں یہ ہی آخری میسج ہے جو نوشیرواں عادل نے اپنے سیل فون سے مجھے سینڈ کیا۔" تفتیشی افسر نپھر سیمیسج سننے لگا۔نوشیراں کی آواز کمرے میں سرسرا رہی تھی۔ "بابا! میں زمینوں پر آیا ہوں ،ٹیوب ویل کی طرف جا رہا ہوں ،چچا موٹر سائیکل پر میرا پیچھا کر رہا ہے اس کیہاتھ پسٹل بھی ہے۔"

"صرف گرفتار نہیں کرنا بیعزتی بھی کرنی ہے چپیڑیں بھی لگانی ہیں۔"ہدایات جاری کر دی گئیں۔

یہ پیسے کی طاقت تھی کہ پولیس بوہے باریاں پھلانگ کر نہیں، توڑ کر پروفیسر غلام حیدر کے گھر میں گھسی ، وہ قسمیں اٹھاتا رہا،:"میں تو کالج بھی نہیں گیا طبیعت خراب تھی سارا دن گھر پڑا رہا" لیکن بھین چود، دھی چود کی قے کرتے ہوئے ،تھپڑ مکے مارتیہوئے بیوی بیٹیوں کے سامنے غلام حیدر کو گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا۔پروفیسر کی عینک فرش پر گر پڑی تھی کسی بوٹ تلے آ کر کچلی گ ء۔بیٹی نے سسکتے ہوئے کہا:"بابا کو تو عینک کے بغیر نظر نہیں آتا،اب وہ کیا کریں گے۔؟؟"پولیس ریمانڈ پر ریمانڈ لیتی رہی ،پر کچھ ہفتوں یا مہینوں بعد غلام حیدر چھوٹ کر گھر آ گیا اور پھر کچھ دنوں بعد ہی کسی چاپ کا رات گئے گلیوں میں پھیرا شروع ہو گیا۔رات جیسے جیسے بھیگتی جاتی، ایک سایہ سا دیوانہ وار گھومتا، وہ ہر رات کسی گھر کے گیٹ کیا ہر دیوار سے کان لگائے دیر تک کھڑا رہتا تھا، چار دیواری کے مقیم جانتے تھے کہ وہ کون ہے ! کیا ہے اور کیوں ہے !! لیکن خاموشی اوڑھے رہتے تھے۔دن کی روشنی میں تو کئیوں کا پانچ بار مسجد میں اورنگ زیب میاں صاحب سے ٹاکرا ہوتا ،علیک سلیک ہوتی، ہر بار خیر خیریت بھی پوچھی جاتی، پر رات کی بات نہ ہوتی تھی۔رات گ ء بات گ ء والا معاملہ بھی نہیں تھا۔بات تو جاتی ہی نہیں تھی، بات تو ایسی لاش بن گ ء تھی جو بیچ چوراہے کے پڑی ہو، پٹریفیکشن شروع ہو، کیڑے کلبلا رہے ہو لیکن اسے دفنایا نہ جا رہا ہو یا دفنایا نہ جا سکتا ہو تعفن چاروں سَمت پھیلتا جا رہا تھا۔

☆

زوراخ بزدار

گڑدغا تئ دل گشغیں بے ملامے تو برو
دل شہ تئ دستا روغیں بے ملامے تو برو

سیث تا وانئے حساواں زانکذی ماپشت کث
تئ اگاں چی ئے گلغیں بے ملامے تو برو

ساہ و سر ما بشکثغو نی ترا مرضی وثی
روح تی چنڈے اڑغیں بے ملامے تو برو

سر شہ سنگاں ساہ شہ جوراں رکھشہ اولا کیا
ار ترا تڑسے ورغیں بے ملامے تو برو

ما کثغو زیند مرگئے وائیدہ قول و سکن
ار ترا آفے تلغیں بے ملامے تو برو

چاکری قولاں نہ گڑداں تو مناں تڑسین ناں
دل اگاں اڑماں پشغیں بے ملامے تو برو

دل منی پرماں بلندیں کوہ سرانی واڑھاں
ار ترا بہواں جنغیں بے ملامے تو برو

ما تہ زوراخاں سکناں پالغا سر ساہ دیاں
تئ دلے ار گیمرغیں بے ملامے تو برو

صندل کے جنگل کی خوشبو

نسیم سید

تم!
صندل کے جنگل کی
بھینی سی
خوشبو
صندل کی
خوشبو والے
اس ساتھ کا
آج اک جام بنائیں
گھونٹ گھونٹ
خود کو پی جائیں
ایسے خواب سے
کیوں جاگیں ہم
اس تعبیر میں
مرنا جائیں ؟
تیزی سے جو
پھیل گئی ہو
ایسی آگ ہو
اس اگنی کا دیا بنائیں

دیے کی لو میں
اتر نہ جائیں؟
پور پور سے جل نا جائیں؟
سب گلیاں
جس موڑ پہ جا کے
رک جاتی ہیں
ایسا موڑ ہو
گلیوں گلیوں
اپنے آپ کو
کب تک کھوجیں
اس رستہ کے
اسی موڑ پہ
اپنی ایک اک
کھوج کو
کھو دیں
اسی موڑ پہ
گم نا جائیں؟